ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

مدیر مسئول:
ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: ۸۵۲۶۱۱

تصانیف : ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

۱	اسلام کی نشأۃ ثانیہ، کرنے کا اصل کام	۱/۵۰
۲	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (ادنیٰ / اعلیٰ)	۳/- / ۴/-
۳	راہِ نجات، سورۃ والعصر کی روشنی میں (ضخیم / مختصر)	۳/- / ۲/-
۴	دعوت الی اللہ	۱/۵۰
۵	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت (ادنیٰ / اعلیٰ)	۳/- / ۴/-
۶	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں (ادنیٰ / اعلیٰ)	۲/- / ۳/-
۷	قرآن اور امنِ عالم	۱/۵۰
۸	علامہ اقبال اور ہم	۲/-
۹	عظمتِ صوم	۱/۵۰
۱۰	قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ	۱۰/-
۱۱	مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب	۱۰/-
۱۲	عیدالاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی	۳/-
۱۳	سرافگندیم	۷/-
۱۴	مطالباتِ دین	۸/-
۱۵	تحریک جماعت اسلامی (ادنیٰ / اعلیٰ)	۱۰ / ۲۰
۱۶	شہیدِ مظلوم (ادنیٰ / اعلیٰ)	۳/ / ۴/
۱۷	اسلام اور پاکستان	۵/-
۱۸	تنظیم اسلامی کی دعوت	۴/-
۱۹	سانحہ کربلا	۳/-
۲۰	رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم	۶/-
۲۱	مسلمانوں کے فرائض دینی اور اسوۂ رسولؐ	۶/-
	عربی ترجمہ :	
۲۲	ماذا یجب علی المسلمین تجاہ القرآن ؟	۵/-
	فارسی ترجمہ :	
۲۳	دین قرآن گردن مسلمان	زیر طبع
	انگریزی تراجم :	
۲۴	The Obligations Muslims owe to the Quran.	۵/-
۲۵	The way to Salvation—in the light of Surah Al-'Asr.	۵/-
۲۶	Islamic Renaissance—The Real Task Ahead.	۳/-
۲۷	The Quran & World Peace.	۳/-
۲۸	Rise & Decline of Muslim Ummah.	۵/-

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

ماہنامہ حکمت قرآن لاہور

جاری کردہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم - اے - پی - ایچ - ڈی - ڈی لٹ (مرحوم)

ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ

بمطابق

جنوری ۱۹۸۴ء

جلد — ۲

شمارہ — ۱۱

مدیر اعزازی

ڈاکٹر ابصار احمد

ایم اے - ایم فل - پی ایچ ڈی

معاون مدیر

حافظ عاکف سعید

ایم اے فلسفہ

فہرس

حرفِ اوّل — ڈاکٹر ابصار احمد — ۳

الٓمٓ (سورۂ احقاف) — ڈاکٹر اسرار احمد — ۵

قرآنی نگاہ میں تاریخ کا مقام — ڈاکٹر غلام محمد — ۱۱

عقیدہ محفوظیتِ قرآن — مولانا سعید الرحمٰن علوی — ۲۱

قدرت کا جوشِ رحمت — مولانا الطاف الرحمٰن نبوی — ۳۸

محاضراتِ قرآنی — حافظ محمد رفیق — ۴۵

یکے از مطبوعات: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور - ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن، لاہور

مطبع آفتاب عالم پریس - زرسالانہ: -/۲۰ روپے اس شمارہ کی قیمت -/۲ روپے

اسلامی تصوّف کے موضوع پر

مشہور محقق پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی

مایۂ ناز تالیف

اسلامی تصوّف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش

اس کتاب میں فاضل مولف نے ان عناصر اور عوامل کی نشاندہی کی ہے کہ جن کی وجہ سے اسلامی تصوّف میں غیر اسلامی عقائد کی آمیزش ہو گئی۔

یہ مایہ ناز کتاب قارئین کے بے حد اصرار پر اب دوبارہ عمدہ طباعت اور ڈائی دار جلد کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کے حُسنِ ظاہری میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

آفسٹ پیپر پر اعلےٰ طباعت، مضبوط اور خوبصورت ڈائی دار جلد قیمت -/۱۵ روپے

ناشر

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ڈاکٹر ابصار احمد

حرفِ اوّل

قیامِ پاکستان جن نظریاتی بنیادوں پر آج سے لگ بھگ ساڑھے چھتّیس برس قبل برِصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی مساعی اور مشیّتِ ایزدی کے تحت معرضِ وجود میں آیا تھا وہ کسی بھی پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے پاکستانی سے پوشیدہ نہیں، اور اس کے بارے میں اختلاف رائے کی قطعاً گنجائش نہیں۔ یہ حقیقت سب کے نزدیک مسلّمہ ہے کہ برِصغیر میں ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ صرف اسلامی نظریۂ حیات اور دینِ متین کو عملی شکل میں نافذ کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ لیکن اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ہم نے اس سمت میں کتنی پیش رفت کی ہے ——— ؟

اس سوال کا جواب ہر ذی شعور پاکستانی مسلمان کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے جس کے ساتھ اس کے مِلّی تشخص کی ضمانت اور دنیا اور آخرت کی فلاح و کامیابی وابستہ ہے۔ راقم الحروف کے سامنے اس وقت چند روز قبل کا ایک مؤقر روزنامہ ہے۔ جس کے سرورق پر جلی حروف میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ اسلام آباد میں حال ہی میں منعقد ہونے والے علماء کنونشن میں ایک متعلقہ علماء کمیٹی نے یہ بات برملا کہی ہے کہ تاحال پاکستان کی پچانوے فیصد معیشت سود پر چل رہی ہے اور غیر سودی سکیمیں اور بینک کھاتے محض نام کی تبدیلی سے زیادہ کچھ نہیں۔ کمیٹی نے یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ بلا سود بینکاری کی جملہ سکیموں کو اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے پیش کیا جائے اور مناسب جرح و تعدیل کے بعد کونسل کی تجاویز اور سفارشات کے ساتھ ان سکیموں کو رائج کیا جائے۔ تاکہ یہ تمام سکیمیں اور بینکاری کے نظام فی الواقع سود کی لعنت سے پاک اور اسلامی معیشت کے اصولوں پر مبنی ہوں۔

قومی و ملکی سطح پر ہمارا یہی حال ایک اور انتہائی اہم شعبے یعنی نظامِ تعلیم میں ہے جس میں تمام تر بلند بانگ دعاوی کے باوجود کوئی خاص مثبت پیش رفت نہیں ہوئی۔ اور چند سطحی

تبدیلیوں کے ساتھ انگریز سامراج کا تعلیمی نظام و نصاب اب تک ہمارے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے اور قرآن و حدیث اور اسلامی عقائد پر مبنی تعلیمات ابھی تک مختلف تعلیمی کورسز میں وہ اہمیت حاصل نہیں کر سکی ہیں جو انہیں حاصل ہونا چاہیئے تھی اور جن کے ساتھ پاکستان کی نوجوان نسل کو مزین ہونا چاہیئے تھا۔ اس کا نتیجہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے طلباء میں کتاب و سنّت کی بنیادی باتوں سے واقفیت کا فقدان ہے ـــــ اور ظاہر ہے کہ اگر علم ہی نہ ہو، تو عمل کا کیا سوال ہے۔ چنانچہ یہ طلباء اسلامی نظریۂ حیات کو ٹھوس اور حقیقی معنوں میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نافذ کرنے کی معمولی سے معمولی خواہش و آرزو سے تہی دامن ہیں ـــ اس کے بالکل برعکس اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ غیر اسلامی اور مغربی دنیا کے نام نہاد مفکرین کے ملحدانہ تصورات و نظریات کا راگ الاپتے ہیں۔ اور پاکستان میں رہتے ہوئے اور یہاں کی ہر سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی بدیسی نظریات اور فلسفیانہ افکار کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔

یہ صورت حال کم از کم ان لوگوں کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے جو اپنے آپ کو سچا مسلمان اور ملک و ملّت کا خیر خواہ تصوّر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اس تصوّر کے مطابق سعی و عمل کی توفیق ارزانی کریں آمین ثُمَّ آمین !

سلسلۂ تقاریر الٓمٓ

سُورۂ احقاف

مقرر : ڈاکٹر اسرار احمد

السّلام علیکم ۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ۔ اما بعد
اَعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
حٰمٓ ۝ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۝ مَا خَلَقْنَا
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ط
وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَیْتُمْ
مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ
الْاَرْضِ اَمْ لَہُمْ شِرْکٌ فِی السَّمٰوٰتِ ط اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ
مِّنْ قَبْلِ ہٰذَآ اَوْ اَثٰرَۃٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝
صدق اللہ العظیم ۝

سلسلۂ حوامیم کی آخری سُورت سُورۃ احقاف ہے۔ اس سورۃ مبارکہ میں تمہیدی آیات یعنی حٰمٓ ۝ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۝ کے فوراً بعد اسلام کے بنیادی معتقدات یعنی توحید، معاد اور رسالت کے ضمن میں بعض دلائل اور براہین وارد ہوئے ہیں۔ اور جو اعتراضات ان پر منکرین کی طرف سے اٹھائے جا رہے تھے ان کا جواب دیا گیا ہے۔ اور اسکے بعد وہی مضمون جو اس سے پہلی سُورت میں آ چکا ہے ایک نئے اسلوب سے نئے پیرایہ بیان سے سامنے آتا ہے۔ یعنی یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نئے نویلے رسول نہیں ہیں ۔ بلکہ یہ سلسلۃ الذہب ہے ۔ سنہری زنجیر ہے ۔ جو حضرت آدمؑ سے چلی آرہی تھی ۔ آپؐ اس کی آخری کڑی ہیں ۔ اسی طرح قرآن مجید کوئی پہلی کتاب نہیں کہ جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہو بلکہ یہ بھی ایک سلسلہ کتب ہے ۔ جس کی آخری اور مکمل کڑی قرآن مجید ہے ۔ چنانچہ یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہلوایا جارہا ہے ۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ

اے نبیؐ! ان سے کہہ دیجئے کہ میں کوئی نیا نویلا رسول نہیں ہوں جو تمہیں پہچاننے اور ماننے میں اتنی دقت محسوس ہو رہی ہو ۔

کتنے ہی نبی پہلے آئے اور کتنے ہی رسول پہلے مبعوث ہوئے ۔ پھر اسلام میں الوہیت اور رسالت کے درمیان جو خط امتیاز کھینچا گیا ہے اور ان دونوں میں کسی طرح کا کوئی اشتباہ پیدا ہونے سے جس طرح روکا گیا ہے اس کے ضمن میں فرمایا گیا ۔

وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ط

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میرے ساتھ کیا ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا ۔"

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ

"میں تو خود پابند ہوں پیروی کر رہا ہوں اسکی کہ جو میری طرف وحی کیا جارہا ہے ۔"

وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝

" اور میرا مقام اور مرتبہ اور میرا فرض منصبی تو بس یہ ہے کہ میں کھلا کھلا خبردار کردینے والا ہوں ۔ آیت نمبر ۱۲ میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی نبوت اور رسالت کا سلسلہ جاری تھا ۔ قرآن سے پہلے بھی کتابیں نازل ہوئیں تھیں "

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ

"اس قرآن سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے وہ کتاب جو موسیٰ کو عطا کی گئی تھی وہ امام بھی تھی اور رحمت بھی تھی، راہنما بھی تھی اور اللہ تعالےٰ کی رحمت کا مظہر بھی تھی۔"

وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝

"اب اس کے بعد یہ کتاب، یہ کلام پاک، یہ قرآن مجید ہے جو عربی میں نازل ہوا تاکہ خبردار کردے اُن کو جنہوں نے شرک کی روش اختیار کی اور بشارت دے ان کو جو احسان کی روش اختیار کرنے والے ہیں۔"

اس کے بعد اس سورۃ مبارکہ میں دو متضاد کردار سامنے لائے گئے مسلمان والدین کے گھر میں پیدا ہونے والی اولاد میں سے ایسے صالح اور سلیم الفطرت لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو جیسے ہی اپنی پختگی کو پہنچیں عقل و شعور کے اعتبار سے بلوغ کی عمر کو پہنچیں، وہ اللہ تعالےٰ پر اپنے ایمان اور یقین کی تجدید کریں، اور اس کے ساتھ شکر کی روش اختیار کریں اور اس سے خیر کے طالب ہوں، اور اخلاق اور اعمال حسنہ کی توفیق چاہیں۔ ایک دوسرا برعکس کردار بھی سامنے آئے گا کہ جو اس اعتبار سے بالکل دوسری سمت میں چلا جانے والا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً

یہ وہ پہلے کردار کا ذکر ہے کہ "جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا اور چالیس سال کی عمر کو پہنچا۔"

قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ ۔

وہ تو اس نے پروردگار سے عرض کیا' اے اللہ! اے میرے رب! مجھے توفیق دے اس کی کہ میں شکر ادا کر سکوں تیری اس نعمت کا کہ جو تو نے مجھ پر کی اور ان نعمتوں کا بھی جو تو نے میرے والدین پر کیں۔"

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ

"اور مجھے توفیق بخش اسکی کہ میں وہ عمل کر سکوں جو تجھے پسند ہو، اور جس سے تو راضی ہو"

وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ط

"اور میری اولاد کو بھی میرے حق میں نافع بنا دے۔ یعنی میری اولاد بھی نیک اور صالح بن کر اٹھے تاکہ وہ میرے لئے صدقہ جاریہ بن سکے۔"

اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ٥

"میں تیری جانب رجوع کرتا ہوں اور میں تیرے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں۔"

ایک کردار یہ ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا مشتاق بننے کی توفیق عطا فرمائے!

اور ایک دوسرا ناہنجار قسم کا کردار بھی مسلمان والدین کے گھروں میں پروان چڑھ سکتا ہے جسکی طرف اشارہ ہوا۔

وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَا

جو اپنے والدین کا بھی ان کے ایمان اور اسلام پر ان کا استہزاء کر رہا ہے۔ مذاق اڑا رہا ہے۔ اور ان مومن والدین سے کہہ رہا ہے کہ "تف ہے تم پر، تف ہے تمہارے لئے"

اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ

"کیا تم مجھے اس بات سے ڈرا رہے ہو۔ اور مجھے دھمکیاں سنا رہے ہو اس بات کی کہ مرنے کے بعد مجھے پھر اٹھا لیا جائے گا۔ قبر سے میں نکال لیا

جاؤں گا، حالانکہ مجھ سے پہلے نہ معلوم کتنی نسلیں بیت چکی ہیں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جن کو گزرے ہوئے ہزارہا سال ہو گئے اور ان کی ہڈیاں بھی بالکل مٹی ہو کر مٹی میں مل چکی ہیں۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ پھر دوبارہ اٹھائے جائیں۔" ایک طرف اس سرکش اور متمرد شخص کا یہ رویہ سامنے آتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کے مسلمان والدین کا معاملہ

وَهُمَا يَسْتَغِيثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ج

وہ اللہ سے استغاثہ کر رہے ہیں اور اپنے اس بیٹے سے بھی کہہ رہے ہیں کہ ہائے خرابی ہو تیری تو ایمان لا۔ مان اللہ کو، مان آخرت کو، مان بعث بعد الموت کو جزا و سزا کو۔

اس کے بعد تیسرے رکوع میں قوم عاد کا ذکر ہے جن کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔ چونکہ یہ قوم عرب کے اس علاقے میں رہتی تھی جسے "احقاف" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سورہ مبارکہ کا نام سورۃ احقاف ہے۔

آخری رکوع میں اس واقعہ کا ذکر ہے کہ جنوں کا ایک گروہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں آیا۔ اس نے قرآن مجید سنا اور پھر واپس جا کر انہوں نے اپنے ہم جنسوں کو اسلام کی دعوت بڑے ہی پیارے الفاظ میں دی۔ انہوں نے کہا

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ

اے ہماری قوم! یہ اللہ کی طرف پکارنے والے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہو۔ اس دعوت کو قبول کرو۔ اس پر ایمان لاؤ۔

آخر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلقین فرمائی گئی۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ

اے نبیؐ! اگر یہ قریش آپ کی بات سنکر ساتھ نہیں دے رہے اگر مکہ کے سردار،

یہاں کے سربرآوردہ لوگ آپ کی دعوت پر کان نہیں دھر رہے، تب بھی آپ مایوس نہ ہوں - انسان ایمان نہیں لا رہے تو کیا ہے؟ آپؐ کی دعوت پر جن ایمان لا رہے ہیں — آپ کی دعوت کے لئے مکہ کی یہ سرزمین جو ویسے بھی سنگلاخ ہے، اگر لوگوں کے دلوں کے اعتبار سے بھی سنگلاخ ہو گئی ہے تب بھی آپؐ ملول و غمگین نہ ہوں - آپؐ کی دعوت کے پھیلنے کے لئے اللہ تعالیٰ دوسرے راستے کھول دے گا - چنانچہ ان جنوں کے ذکر میں بھی یہ الفاظ وارد ہوتے ہیں کہ ہم نے موسیٰؑ کی کتاب کے بعد پھر اللہ کا کلام سنا - محمد رسولؐ کی زبان مبارک سے - پس آپؐ صبر کیجئے - آپ کا اصل توکل اللہ پر ہے اور آپ اولوالعزم رسولوں کی طرح راہ حق میں آنے والے مصائب پر صبر کئے جائیے - اس صبر کا نتیجہ جلد ظاہر ہوگا -

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ

حضرت نوح کا دھیان کیجئے، یاد کیجئے کیسے ہمارا وہ بندہ ساڑھے نو سو برس تک دعوت و تبلیغ میں مصروف رہا اور اعراض و انکار اور تمسخر و استہزاء کے باوجود اپنے فرض منصبی کو ادا کرتا رہا - لہٰذا آپ کے لئے ابھی صبر ہی کا راستہ ہے - جمے رہئے جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس کو برداشت کیجئے - مخالفت اور رکاوٹیں جو ڈالی جا رہی ہیں ان کی پرواہ نہ کیجئے بلکہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے صبر و ثبات کو اختیار فرمائیے اور اپنی اس دعوت کے لئے اصل زور اس نکتے پر مرکوز رکھئے -

وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ

کہ میں تو ایک کھلا کھلا خبردار کر دینے والا ہوں - اس کے لئے ہمہ وقت اور ہمہ تن دعوت الی اللہ میں لگے رہئے - بظاہر الفاظ خطاب نبی اکرمؐ سے ہے لیکن مقصود یہ ہے کہ آپؐ کے جان نثار صحابہ کو تسلی و تشفی دی جائے چنانچہ عالم واقعہ میں ہوا بھی یہی کہ صحابہ کرام نے تمام مصائب و شدائد کو انگیز کیا، برداشت کیا اور ان مومنین صادقین نے اپنا عمل اس سورہ مبارکہ کی آیت

(بقیہ صفحہ ۳۷ پر)

ڈاکٹر غلام محمد

قرآنی نگاہ میں تاریخ کا مقام

یہ مقالہ ڈاکٹر غلام محمد صاحب، خلیفۂ مجاز علامہ سید سلیمان ندوی، نے "محاضراتِ قرآنی" کے خصوصی اجلاس منعقدہ اکتوبر ۸۳ء میں پیش کیا۔

تاریخ کے معاملہ میں عام طور پر مسلمانوں کی بے اعتنائی کا یا تو یہ عالم رہا کہ اس کو دینی نصاب سے خارج رکھا گیا اور علمائے دین اس کے شغل کو اپنے لئے کسرِ شان سمجھتے رہے یا پھر وہ وقت آیا کہ ایک طبقہ نے اس کی طرف توجہ کی تو اس کے درجہ کو بڑھا کر دینی مسلّمات کے پرکھنے میں حجت و برہان کے رتبہ تک پہنچا دیا

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی　　تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اس افراط و تفریط سے بچنے اور تاریخ کے صحیح مقام اور اس کی افادیت کے دائرہ کی تعیین کے لئے ہم قرآن پاک ہی سے رجوع کرتے ہیں کہ وہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً (نحل۔ ۸۹) کی صفت سے متصف ہے۔

قرآن گو صحیفۂ تاریخ نہیں مگر اس میں امم سابقہ کے حالات، ان کے عروج و زوال کے اسباب اور خود ان واقعات کے ذکر کرنے کی غرض و غایت کو جا بجا واضح کیا گیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اسلام جس کی دعوت اس ادعا سے اٹھی ہو کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (التوبہ ۳۲) اور جس کے داعیوں کو یہ حکم ملا ہو کہ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (سورہ انفال۔ ۳۹) اس کی کتاب ہدایت میں جینے کے گر اور مرنے کے اسباب کی گرہ کشائی نہ کی گئی ہو، اسی لئے ہماری کوشش ہے کہ ہم اسی شمع ہدایت کو لے کر تاریخ کے مقام کا تشخص دریافت کریں اور افراط و تفریط سے بچ کر نقطۂ اعتدال پر قائم رہ سکیں۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا

اہمیت تاریخ کی اہمیت کے لئے قرآن پاک میں اور آیتیں موجود نہ بھی ہوتیں تو صرف اس کا وَالْعَصْرِ کا انتباہ تاریخ کی اہمیت کے اظہار کے لئے نہایت کافی تھا۔ وَالْعَصْرِ

کا مفہوم ہی یہ ہے کہ "زمانہ کی خود اپنی داخلی حقیقت و تصور اور دن رات کے خارجی تجربات و مشاہدات" انسانی کی غور و فکر نقطۂ تاکیدی قرار پا رہے ہیں۔ صاحب روح المعانی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے العصر کے معنی "نوائب الدھر" ہی کے نقل کئے ہیں یعنی تاریخ روزگار یا حوادث زمانہ ـــــ مگر قرآن پاک نے محض اس قسم یا شہادت ہی پر بس نہیں کیا بلکہ تاریخ کی اہمیت جتلانے کے لئے تاریخ دانی اور تاریخ بیانی کی تاکید ہر مبلغ دین کو کر دی کہ وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللّٰهِ۔ (ابراھیم ۵)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "اَیّامِ اللّٰہِ" سے مراد حق تعالیٰ کے انعامات اور اس کی طرف سے آنیوالے ابتلاآت ہیں۔ دوسری جگہ انہیں نے اور مقاتل، الربیع اور ابن زید نے صاف صاف فرمادیا کہ اس سے مراد امم سالقہ کے واقعات ہیں اور علامہ زمخشری کا ارشاد ہے کہ اہل عرب اس لفظ کا استعمال ہی "وقائع" (جس کو ہم اپنی بولی میں تاریخ کہتے ہیں) کے لئے کرتے ہیں ـــــ لہٰذا اب تاریخ کی اہمیت بلا تاویل ثابت ہوگئی ایک اور جگہ قرآن مجید میں تاریخ پر توجہ رکھنے کی تاکید اس انداز سے فرمائی گئی ہے کہ

تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ — ہم عزت و نکبت کے دنوں کو لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔

یعنی قرآن پر ایمان رکھنے والے اس بات کو سمجھ لیں کہ یہ عروج و زوال کسی اندھیری بہری "مشیّت تاریخ" کا اثر نہیں بلکہ اس کے بندھے ٹکے ربانی ضوابط ہیں، جن کو سمجھ کر مسلمان زوال سے محفوظ اور عروج سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن پاک نے تاریخی آثار کی تلاش و تحقیق اور ان میں غور و فکر کر کے عبرت حاصل کرنے کی تک ترغیب دلائی ہے، ارشاد ہے۔

فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (آل عمران)

بہرکیف تاریخ کی اہمیت قرآنی نگاہ میں معلوم ہو چکی، اب ذرا یہ سمجھتے چلیں کہ قرآن پاک کا تاریخی اسلوب کیا ہے اور کیوں ہے؟

اسلوب قرآنی کی حکمت قرآن چونکہ اصلاً صحیفۂ تاریخ نہیں ہے، اس لئے تاریخ عالم کا احاطہ اس کے ذمے نہیں۔ اس میں تو صرف اطراف عرب

کے چند پیغمبروں اور" بیس تیس اقوام و اشخاص سے زیادہ کا تذکرہ نہیں"[1] اور یہ تذکرہ بھی مثلاً قوم عاد و ثمود یا قوم لوط و بنی اسرائیل کا تفصیلی بیان نہیں بلکہ ان کے جستہ جستہ واقعات جن کے وقوع کے نہ ماہ و سال کا تعین ہے، نہ جن کے بیان میں تاریخی ترتیب ملتی ہے، البتہ ان قوموں کے بناؤ اور بگاڑ اور عزت و نکبت کے ظاہری اسباب اور معنوی علل کو جا بجا بیان کیا گیا ہے ـــــ قرآن پاک نے یہ اسلوب تین وجہ سے اختیار کیا ہے، ایک تو اس لئے کہ لوگ اس کو "ہدایت" و "فرقان" کے بجائے تاریخ کی کتاب نہ سمجھ بیٹھیں اور دوسرے اس لئے کہ اگر اس میں تعین سن و سال کے ساتھ واقعات مندرج ہوتے تو یہ جزئیات بھی لازمۂ ایمان بن جاتیں جس کا کوئی نفع تذکیرِ آخرت اور اصلاحِ حال میں حاصل نہ ہوتا، اب یہ اسلوب بیان خود اس امر کی دلیلِ محکم بن گیا کہ ان واقعات سے قرآن کا مقصود صرف تذکیر ہے یا یوں کہئے کہ اس اسلوب قرآنی سے یہ رہبری ملی کہ تاریخ کو سبق آموزی اور عبرت پذیری کا ذریعہ بنائے رکھنا چاہیئے، یہی اس کی افادیت ہے، تیسری حکمت اس اسلوب کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن اپنے پڑھنے والوں کے ذہن میں اس بات کو راسخ کرنا چاہتا ہے کہ اس کا منشاء ان تاریخی اجزاء کے بیان سے یہ ہے کہ ان واقعات سے متعلق کر کے جو اسباب و علل ظاہری ہوں کہ معنوی، بے نقاب کئے گئے ہیں ان پر مسلمانوں کی نظر مرتکز رہے اور اسباب و علل کی اس دنیا میں وہ ان سے غفلت برت کر خسارے میں نہ پڑ جائیں، ہمارے اس خیال کی تائید میں قرآن پاک کا یہ انتباہ کافی ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ	تحقیق کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں
حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ	بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف
(الرعد)	نہیں بدل لیتی

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی ذہن میں محفوظ کر رکھنے کے لائق ہے کہ جس طرح آیاتِ قرآنی کے مطالب اور مفاہیم ان کے شانِ نزول سے متعلق ہو کر محدود و محصور نہیں ہو جاتے بلکہ شانِ نزول کا علم صرف اعانتِ فہم کا فائدہ رکھتا ہے، اسی طرح قرآن پاک نے جن جن پیغمبروں، قوموں، بستیوں یا ادوار سے متعلق کر کے اجتماعی عروج و زوال کے اسباب و علل بیان کئے

---

[1] ارض القرآن (علامہ سید سلیمان ندوی) زیرِ عنوان "تاریخ ارض القرآن"

ہیں وہ بھی ان واقعات سے متعلق ہو کر وقتی اور محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں آفاقیت اور دوام کی شان ہے اسی لئے ان کا معلوم کرنا اور رہتی دنیا تک برتنا ضروری ہے۔ مثلاً مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے لئے صرف یہی کافی نہیں وہ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ کے پابند رہیں بلکہ قومی بقا اور سربلندی کے لئے قرآن اس بات کو ضروری ٹھہراتا ہے کہ انہیں اتفاق و اتحاد، ایثار، وحدتِ مطلب، جوشِ جہاد اور ولولۂ اعلائے کلمۃ اللہ کی روح کارفرما رہے، وہ ظاہری اسباب سے بے اعتنائی نہ برتیں مگر اسباب پر بھروسہ کے بجائے ذاتِ حق پر تکیہ رکھیں، اس تعلیم جامع سے قرآن پاک بھرا پڑا ہے، مثال کے لئے سورۂ انفال کی اکسٹھویں اور باسٹھویں آیات کے دو اجزاء پیش ہیں، حکمِ ربانی ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ	اپنی استطاعت بھر جو کچھ جمع کر سکو مہیا رکھو
قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ	سامانِ حرب اور پلے ہوئے گھوڑے تاکہ
بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَ	اس کے ذریعہ اللہ کے اور تمہارے دشمن
اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ	اور دوسرے اعداء پر دھاک بیٹھ جائے۔

آگے فرمایا:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا	اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہو تو تم بھی اس
وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ	کے لئے آمادہ ہو جائے اور اللہ پر بھروسہ رکھو

حاصل مطلب یہ ہے کہ اگر جینا ہے تو تدبیر و توکل کو ایک ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔

؎ چارہ کن پس تکیہ بر جبار کن

قرآن کے نظریۂ تاریخ کی وسعت

اس کے باوجود کہ قرآن کا اسلوب تاریخ کا تفصیلی بیان نہیں ہے پھر بھی اس کے نظریۂ تاریخ کی وسعت کو کوئی غیر نہیں پہنچ سکتا۔ آسوالڈ اشپنگلر (OSWALD SPENGLER) نے جو یورپ کے مادی انقلاب سے متاثر تھا ہر دور کو ایک وجودِ عضوی (ORGANISM) قرار دے کر اس پر تمدن کے عروج و زوال کے اصول وضع کئے، ہیگل نے ذرا کچھ اونچا ہونے کی کوشش کی۔ اس نے تاریخی ارتقاء کو ایک ایسا جدلی عمل (Dialectical Process) قرار دیا جس کی محرک "روحِ عالم" (World Spirit) کو قرار دیا اور کہا کہ یہی "روحِ عالم" اپنے ارتقاء کے لئے دنیا میں سب کچھ کرا رہی ہے اور جتنی تاریخی شخصیتیں

ہیں وہ دراصل روحِ عالم کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ انہیں اپنے حصولِ مقصد کے لئے کام میں لاتی رہتی ہے[1] خود یہ روحِ عالم کیا ہے؟ اس کی حقیقت نامعلوم ہی رہی۔ بہرحال پھر کارل مارکس نے ایک نظریہ تاریخ پیش کیا جس طرح سگمنڈ فرائیڈ کے ہاں سارے جذبات انسانی اور ان کی نمود کے آثار کا پرکار "جنس" کے نقطہ پر گھوم کر دائرۂ حیات بناتا ہے، اسی طرح کارل مارکس کے ہاں حیات انسانی کی ساری ہماہمی کا محرک محض "پیٹ" ہے۔ اس لئے اس نے ہیگل کے جدلی عمل کی بنیاد مادیت میں بھی محض معاش پر رکھ کر نظریۂ تاریخ پیش کیا جس کی تعریف اینجلز نے یوں کی کہ "مارکس نے انسانی تاریخ میں اس قانون کو معلوم کیا اور ایسی بدیہی حقیقت کا پتہ لگایا جو نظری بحثوں میں گم ہو کر رہ گئی تھی ـــــ ایک بے بصر کی دوسرے محرم نظر اس کے سوا اور تعریف کر بھی کیا سکتا تھا، ورنہ مارکس کی یافتِ حقیقت کو "ٹیڑھی کھیر" کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے

؎ چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

تاریخ کا سچا اور صحت بخش نظریہ قرآن اور صرف قرآن نے پیش کیا ہے، وہ انسانی تاریخ کے ابتدائی سرے کو مادیات میں نہیں بلکہ عالم ارواح میں پہنچا ہوا اور تخلیق انسانی کے مرحلۂ اوّل سے جڑا ہوا دکھلاتا ہے، ارشادِ قرآنی ہے:۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ ، ۳۰)	وہ وقت قابل ذکر ہے جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اور فرمایا:

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (الحجر ، ۲۹)	جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔

پھر جب وہ خاکی پتلا جیتا جاگتا آدم بن گیا اور اپنی ذریت کے ساتھ اس نے اسی عالم ارواح میں بزم سجالی تو خالق مالک نے سب سے پوچھا "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟" (کیا

---

[1] ہیگل: "فلسفۂ تاریخ"

میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) تو بھری بزم سے نعرۂ شوق بلند ہوا "بَلٰی شَهِدْنَا" (اعراف، ۸۱) کیوں نہیں، آپ ہی ہمارے رب ہیں اور ہم اس پر گواہ۔

اس طرح توحیدِ خالص کو ارتقائے تاریخِ انسانی کا نقطۂ آغاز اور قوتِ محرکہ بنایا گیا اور قرآن نے بتلایا کہ "روحِ عالم" نہیں بلکہ "روحِ حق" اور "مشیّتِ تاریخ" نہیں بلکہ "مشیّتِ حق" سارے دائرۂ امکان میں جاری و ساری اور کارفرما ہے اور اسی لئے حق کی اطاعت اور مرضیٔ حق پر پوری زندگی کو وقف کر دینا حیاتِ انسانی کی کامرانی ہے پھر یہ بھی بتلا دیا کہ مادی اسباب و علل کا جو جال پھیلا ہوا نظر آتا ہے اس کے پیچھے معنوی اسباب و علل بھی ہیں جو زیادہ مؤثر اور قوی ہیں اور تاریخی ارتقاء میں ان کا زیادہ دخل ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ارشادِ ربّانی ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا	اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور
وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ	تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین
مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ	سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے،
كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا	مگر انہوں نے جھٹلایا۔ لہٰذا ان کے
كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ	اعمال کے بدلے میں ہم نے انہیں
(الاعراف: ۹۶)	پکڑ لیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک مادہ کو روح سے متعلق اور دنیا کو آخرت سے مربوط کر کے انسانی فلاح و بربادی کے اسباب و علل کو بیان کرتا اور تاریخ سازی میں ان کو دخیل قرار دیتا ہے۔ اور یہ صرف اسلام ہی کا طغرائے امتیاز ہے کہ یہاں فرد و اجتماع کا وہ امتزاج رکھا گیا ہے جسمیں اجزائے ممتزجہ اپنی انفرادیت مٹا نہیں بیٹھتے۔

تاریخی استفادہ کا دائرہ مذکورہ نظریہ کو سمجھنے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ قرآن پاک کی افادیت کو تذکیر اور عبرت پذیری کے دائرہ میں محصور رکھنا چاہتا ہے، سورۂ ص میں قومِ نوح، عاد، ثمود، فرعون، قومِ لوط اور اصحابِ ایکہ کی طغیاں شعاری کے مختصر ذکر کے بعد حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعات کا قدرے تفصیلی ذکر آیا ہے ——— مگر قہر و مہر کے مستوجب ان لوگوں کے قصص کا ذکر کرنے سے پہلے ہی ذہنِ انسانی میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے اور قسم سے اس کو مؤکد

کر دیا گیا ہے کہ :-

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ — صٓ ۔ قسم ہے قرآن کی جو نصیحت کرنے والا ہے ۔

اور پھر ختم پر بھی مزید اس حقیقت کو راسخ کر دیا گیا ہے کہ

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ — یہ قرآن تو ایک نصیحت نامہ ہے تمام جہان والوں کے لئے

اور دیکھئے قرآن پاک میں سورۂ یوسف ہی وہ سورۃ ہے جس میں ایک پیغمبر کے حالات بچپن سے آخر عمر تک تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور اس تفصیل کے دوران نفسِ انسانی کی آمادگی اور اس سے رونما ہونے والی خرابیاں، اللہ کی طرف سے آزمائش پر آزمائش اور اس میں مردِ حق آگاہ کی پامردی اور اس پر ربانی انعامات کا ظہور، سب ہی کچھ آگیا ہے، مگر اس سب کا حاصل آخر میں یہ جتلایا گیا ہے کہ :

لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (یوسف: ۱۱۱) — تحقیق کہ اگلے لوگوں کے واقعات میں اہلِ عقل کے لئے عبرت کے سامان ہیں ۔

پس معلوم ہوا کہ تاریخ دانی کا حاصل قرآن یہ چاہتا ہے کہ سبق آموزی اور عبرت پذیری رہے ۔ اسی منشاء کی تائید میں بے شمار آیتوں کے منجملہ ایک آیت ہے جو سورہ ہائے یوسف، روم، مومن، انفال اور ملائکہ میں دہرائی گئی ہے اور وہ یہ ہے ۔

فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔ — (کاش) انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ۔

اس سے بھی یہی بات معلوم ہوئی کہ تاریخ کا اصل فائدہ عبرت حاصل کر کے اپنی زندگی کو بربادی سے بچانا ہے ۔

بلند حوصلگی کا قیام تاریخ کے مذکورہ فائدہ کے علاوہ اس کی ایک اور افادیت کی صراحت بھی ہمیں قرآن پاک میں ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے اہلِ قوم و ملت میں بلند حوصلگی اور ہمت و عزیمت کے قیام کا فائدہ بھی اٹھانا چاہیئے ۔ سورۂ ھود میں پیغمبرِ خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے :-

وَکُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ — (اے محمدؐ) اور پیغمبروں کے حالات جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان سے ہم تمہارے دل کو ثابت و

وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مستحکم کرتے ہیں اور ان قصص میں تمہارے
مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ پاس حق پہنچ گیا اور یہ مومنین کے لئے
(ھود : ۱۰۰) نصیحت وعبرت ہے۔

اس آیت میں " مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ " کا افادہ بہت توجہ طلب ہے۔ اسلام کے شاندار ماضی کی یاد اہل اسلام کی رگوں میں عزم نو کی لہر یقیناً آج بھی دوڑا سکتی ہے اور ان کی گراوٹ کے ادوار کو نگاہوں میں لانا عبرت اور حمیت دینی کی بیداری کا محرک بن سکتا ہے۔

بس یہ حدود ہیں تاریخ کی افادیت کے اور یہی اوج ہے اس کے رتبہ کا، اس سے آگے تاریخ کو دین کے مسلمات کے مقابل لانا اور تاریخ پر حقائق دینی کو پرکھنا، یہ قرآن نافہمی کا نتیجہ ہے۔

تاریخ کو دین میں حجیت کا درجہ حاصل نہیں

وجہ اس کی یہ ہے کہ تاریخ کو قطعیت کا رتبہ کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکا اور نہ ہو سکتا ہے۔ مشاہدہ کی غلطی، زاویۂ نگاہ کا فرق، قیاس کی انفرادیت وغیرہ ایسے عوامل ہیں کہ ایک ہی واقعہ ہم غیر کی نگاہوں کے سامنے ظہور پذیر ہوتا ہے اور بیان کرنے والوں کی تعبیرات مختلف ہو جاتی ہیں، ہمارے دور کے قریبی حوادث میں گاندھی جی کی موت، بہادر یار جنگ اور لیاقت علی خان کی شہادت یا حیدر آباد کا سقوط اور ہندوستان کی تقسیم اور دو سلطنتوں کا الگ الگ قیام بہ ظاہر نہایت بدیہی واقعات ہیں، لیکن ان موضوعات پر جو تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان میں تعبیرات کا فرق محرکات کے تعین کا اختلاف، ذمہ داری کا الزام اور فتحیابی کا سہرا باندھنے میں اہل قلم کس قدر مختلف ہو گئے ہیں پھر جو بات آج کی تاریخ کی ہے وہی صدیوں پہلے کے حوادث کی تاریخ کی ہے۔ شہادت عثمان ذوالنورین ہو یا نصب خلافت علی مرتضیٰ، جانشینی یزید بن معاویہؓ ہو یا شہادت حسین ابن علیؓ وغیرہ وغیرہ، ان میں سے کسی عنوان کے مؤرخانہ بیانات کو قطعیت کا درجہ کہاں حاصل ہے؟ اسی لئے حکیم الامتہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ " تاریخ بھی کوئی حجت ہے؟ تاریخ کا اعتبار ہی کیا۔ اگر کوئی تاریخ کو دلیل صحیح کے مقابلہ میں پیش کرے گا تو ہم سے سے کہیں گے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ تاریخ صحیح ہے[1]

---

[1] ملفوظات یومیہ۔ ملفوظ نمبر (۴)

خیر یہ تو عقلی دلیل ہوئی، ہم کو تو قرآن پاک ہی سے تاریخ کی بے اعتباری کا سبب معلوم کرنا ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام، فرعون کے دربار میں داعیٔ حق بن کر پہنچتے ہیں، فرعون ان سے پہلا سوال ربوبیت مطلقہ کے بارے میں کرتا ہے اور اس کا جواب پاکر بلاجرأتِ تردید دوسرا سوال کرتا ہے جو سورۂ طٰہٰ کی اکاون ویں آیت میں یوں نقل ہوا ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ؟ — بولا، پھر کیا حقیقت ہے پہلی نسلوں اور قوموں کی؟

مطلب یہ ہے کہ ذرا پچھلی تاریخ کے چند اوراق قطعیت کے ساتھ سنائیے۔ حضرت موسیٰؑ یہ حکیمانہ جواب دیتے ہیں: قرآن نے اپنی شہادت کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے کہ:

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى۔ — بولے، اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتہ میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ بہکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔

معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کے علم قدیم میں چونکہ بہک جانے اور بھول چوک کا احتمال محالِ عقلی ہے۔ اس لئے ان کی بات اٹل ہے اور چونکہ اس کے سوا ہر غیر میں یہ قباحت موجود و مشاہد ہے اس لئے کسی غیر کی بات پائدار اور لائقِ اعتبار کامل طور پر ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا "تاریخ" کو قطعیت کا رتبہ نہیں مل سکتا اور اس بے اعتباری کے نقص کے ساتھ اس کو دین کی دلیلِ قطعی کے مقابل لانا محض اپنی فہم و فراست کا مذاق اڑانا ہے ——

علامہ ابنِ خلدون نے اس آیتِ پاک سے استشہاد کے بغیر ہی تاریخ کی بے اعتباری اور اس میں جھوٹ سچ کی آمیزش کے چھ اسباب اپنے گرانقدر "مقدمہ" میں بیان کئے ہیں، یہ اور اس نہج کے اور جتنے اسباب معلوم کئے جاسکیں وہ سب قرآن پاک کے دو لفظی بلیغ اظہار سے باہر نہیں ہوسکتے۔ —— یورپین مؤرخین کے ادعائے تاریخی کا سب سے بڑا سبب کتبات اور آثار ہیں، مگر یہ بھی قطعی ہو نہیں سکتے، اس کی وجہ صاحب اصح السیر (ابو البرکات مولانا عبدالرؤف دانا پوری) نے اپنے قیمتی مقدمہ میں خوب بیان کی ہیں۔ کہ "یورپ نے تاریخ امم کی تحقیق کا ایک جدید طریقہ جاری کیا ہے یعنی کتبات و آثار وغیرہ سے وہ مختلف ملکوں کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں، ایسی مرتب کردہ تاریخ کا جہاں شرائع

سے تعلق ہو، وہاں بالکل اعتبار کے قابل نہیں ہیں، اگرچہ اس کو صحیح معلومات کا بہت قوی ذریعہ سمجھا جاتا ہے، اس کے کئی وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کا انتظام زیادہ تر ایسے ہاتھوں میں ہے جو اصولاً مذہب ہی کے خلاف ہیں، دوم کتبات و آثار کو اس طریق تحقیق کی بنیاد قرار دی جاتی ہے مگر اس بنیاد پر فرضی اور قیاسی نتائج کی ایک عمارت تیار کر لی جاتی ہے۔ اور قیاسات میں ہمیشہ تغیر و تبدل ممکن ہے، سوم کتبات و آثار جس پر اس عمارت کی بنیاد ہوتی ہے۔ اس میں بہت دھوکا ہو سکتا ہے، چہارم جدید کتبات اور جدید آثار کا دریافت کرنا دات اور شہرت کا بہت بڑا ذریعہ ہے اس لئے جدید معلومات حاصل کرنے میں بہت کچھ کارستانیاں کیجاتی ہیں۔"

حاصلِ کلام بس اب واضح ہو گیا کہ عقلاً تاریخ میں قطعیت اور صداقت کاملہ کی صفت نہ تو پائی جا سکتی ہے نہ قرآن ہی اس کو "دینی حجت" کے درجہ میں قبول کرتا ہے ـــــ قرآن پاک کی نگاہ میں تاریخ گو بہت اہم چیز ہے اور اس کی طرف سے اغماض ضرر رساں ہے مگر اس کی افادیت کا دائرہ تذکیر، درسِ عبرت، اجتماعی امور میں عروج و زوال کے اصولوں کی تلاش، بلند حوصلگی، حمیت ملی اور سنگینیٔ عزم کے قیام کو محیط ہے۔

اگر تاریخ کے مقام کا یہ قرآنی تعین و تشخص اپنوں کی نگاہ میں روشن رہتا تو گذشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں جتنا لٹریچر شیعیت اور ناصبیت نے پیدا کیا ہے یا آج بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر اچھے اچھے بظاہر غیر شیعی اور غیر ناصبی ذی علم اہلِ قلم کے ہاتھوں نکلتا ہی چلا جا رہا ہے اور جس کی وجہ سے عظمتِ صحابہؓ، ناموسِ اہلبیت بلکہ غور سے دیکھئے تو کارنامۂ نبوت اور صداقتِ اسلام تک مشتبہ ہو کر رہ گئی ہے، ظہور میں نہ آتا اور اساس ملت ڈھ کر رہ نہ گئی ہوتی ـــــ اور ساتھ ہی ساتھ دوسری طرف یہ بھی نہ ہوتا کہ تاریخ سے بے التفاتی کے سبب ہمارے لائقِ فخر علمائے کرام خصوصاً مفسرینِ عظام سے بعض ضمنی و ذیلی ہی نوعیت کی سہی، تاریخی اور جغرافیائی غلطیاں جو تفاسیر و تصانیف میں درج ہو گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اہلِ استشراق کو خندہ زنی کا موقع ملتا اور نہ ان تسامحات کو طشت از بام کر کے وہ ہمارے علماء کی ساری کاوشِ علمی کو عام مسلمانوں خصوصاً انگریزی تعلیم یافتگان کی نگاہ میں بے وقعت و ناقابل التفات ٹھہرا سکتے،

؎ ایں قدر گفتیم باقی فکر کن!

مولانا سعید الرحمٰن علوی

عقیدہ محفوظیّت قرآن

یہ مقالہ مولانا سعید الرحمٰن صاحب علوی نے محاضراتِ قرآنی کے خصوصی اجلاس منعقدہ اکتوبر ۸۳ء میں پیش فرمایا۔

انجمن خدام القرآن لاہور وطن عزیز کا ایک مؤقر ادارہ ہے جو قرآن عزیز کی اشاعت و ترویج میں مصروف ہے اور رجوع الی القرآن کے لئے جد و جہد کر رہا ہے۔ اس جد و جہد کا ایک حصہ وہ محاضرات ہیں جن کا اہتمام سال میں ایک بار کیا جاتا ہے تاکہ اہل علم و دانش باہم مل بیٹھ کر مختلف قرآنی موضوعات پر ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہ ہو سکیں۔

امسال اس نوع کا یہ دوسرا پروگرام ہے جس کے لئے پڑوسی ملک ہندوستان سے اہل علم کا ایک قافلہ تشریف لایا ہے۔ اس قافلہ کا ایک ایک فرد علم و فضل کے اعتبار سے اپنی مخصوص حیثیت کا حامل ہے۔

اس قافلہ کی آمد پر پاکستانی طلبہ کے ایک حقیر نمائندہ کے طور پر جہاں میں ان ارباب علم کو خوش آمدید کہتا ہوں وہاں انجمن کے صدر اور دوسرے رفقاء کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس سیمینار کا اہتمام کیا اور اہل پاکستان کو موقعہ فراہم کیا کہ وہ ایسے منتخب اہل علم سے استفادہ کر سکیں۔

ان محاضرات کے لئے انجمن کے ارباب حل و عقد بالخصوص ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مجھے بھی ایک مقالہ کی تیاری کا ذمہ دار ٹھہرایا جسے یہاں پڑھا جا سکے۔ موضوع کا معاملہ میرے اوپر چھوڑ دیا گیا تو میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد اس موضوع کو اختیار کیا

حضور نبی مکرم رحمت دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اصحابہ وسلم کے دور سعادت میں جب یہ قرآن نازل ہو رہا تھا تو کفار و مشرکین مکہ قرآن پر طرح طرح کے الزامات لگاتے، اسے نبی کریم علیہ السلام کا کلام بتاتے، ایجادِ بندہ کہتے اور مختلف حیلوں بہانوں سے اس کے معاملہ میں لوگوں کو برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن ان کی ایک نہ چلتی۔ اس

لئے کہ یہ کلام الٰہی تھا۔ اس کا محافظ خود ربِ کائنات تھا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (الحجر)، لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (القیامہ) ان لوگوں نے ایک مرحلہ پر یہ کوشش بھی کی کہ قرآن میں ترمیم و تبدیلی کی کوئی شکل پیدا ہو جائے۔ اس سلسلہ میں باقاعدہ حضور علیہ السلام سے انہوں نے گفتگو کی۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک خوفناک چال تھی۔ اس کے ذریعہ بھی وہ قرآن کا اعتماد مجروح کرنا چاہتے تھے لیکن نبوی فراست کے سامنے ان کا یہ داؤ بھی نہ چل سکا اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کی بروقت رہنمائی کر کے آپ پر واضح کر دیا کہ ان کی اس خواہش کا جواب یوں دیں کہ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. (یونس) ——!!

اس قسم کے مراحل سے گذرنے کے بعد اللہ کا دین مکمل ہوا اور قرآن عزیز حفاظتِ ربانی میں تکمیل کو پہنچا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ کا اعلان دنیائے کفر و ضلالت کے لئے ایک برق و رعد تھا جس نے ان کے خرمنِ ضلالت کو بھسم کر کے رکھ دیا۔ اب ان کے سامنے کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ اس صحیفۂ ربانی کو نابود کر سکتے۔ صحابہ علیہم الرضوان نے اپنا خون دے کر اور تمام صلاحیتیں خرچ کر کے اس کی حفاظت کی، اسے چار دانگِ عالم میں پھیلایا اور یہ اس کا لازوال معجزہ تھا کہ مختلف بولیاں بولنے والے اور مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے اس کلام سے یکساں تعلق رکھتے جس زبان میں یہ نازل ہوا اس میں اسے پڑھتے اور اپنی روح کی تازگی کا سامان فراہم کرتے۔ تا آنکہ معتزلہ اسکول نے بعض عباسی حکمرانوں کی سرپرستی میں اس کے کلام الٰہی ہونے کے عقیدہ کو چیلنج کر کے ایک نازک صورت پیدا کر دی لیکن اللہ تعالیٰ کی ان گنت رحمتیں نازل ہوں امام دعوت و عزیمت حضرت امام احمد بن حنبل قدس سرہٗ اور ان جیسے چند دوسرے جاں نثارانِ حق پر کہ انہوں نے وقت و اقتدار کی ہر تلخی برداشت کر کے قرآن کے معاملے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کیں اور اس طرح معتزلہ کی بھڑکائی ہوئی آگ بجھ کر رہ گئی اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا عقیدہ پوری قوت سے ابھرا اور آج تک ایک ارب سے زائد کلمہ گو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی تیرہ بختی ہے

قطع نظر امت کی تاریخ میں دو ہی طبقے ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے دعوائے اسلام کے باوصف ان مسلمات کو جھٹلایا جو قرآن کے معاملے میں طے شدہ تھے۔ ایک معتزلہ جن کا ذکر مختصراً آپ نے سنا تفصیل مطلوب ہو تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت ملاحظہ فرمالیں ـــــ دوسرا طبقہ جس نے ادعائے اسلام کے باوجود قرآن کو اپنی مشق ستم کا نشانہ بنایا اور اس کی محفوظیت کے عقیدہ کو چیلنج کیا وہ طبقہ ہے حضرات اہل تشیع کا۔ جن کے متعلق اس وقت کسی قدر تفصیل سے کچھ گذارشات پیش کرنی ہیں۔ یقین جانیں کہ اس سے ہمارا مقصد بعض برادران اہلسنّت کو اس نازک صورت حال کی طرف متوجہ کرنا ہے جو حاملین قرآن ہونے کے ناطے سے ان کی ذمہ داری ہے۔ ورنہ کسی طبقہ یا فرقہ سے ہمیں بغض ہے نہ عناد!

ہم تو محض چمن میں اپنی شاخ کی سلامتی کے خواہاں ہیں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ صیاد رہتا ہے یا نہیں! ظاہر ہے کہ جو طبقات پہلے دن سے موجود ہیں انہیں بیک قلم ختم کرنا نہ ہمارے بس میں ہے نہ ہماری یہ کوشش و خواہش ہے ہم تو صرف اپنے بھائیوں کو حقائق سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ کسی وقت کسی پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اپنی متاع کو اپنے ہاتھ سے کھو نہ بیٹھیں۔

اس لئے درخواست ہے کہ ہماری معروضات کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سنیں۔ اور سن کر اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر کے دوست دشمن کی تمیز پیدا کریں کہ دنیا میں کسی قوم کی حیات اجتماعی کا انحصار اسی پر ہے ـــــ اللھم وفقنا لما تحب وترضی

تاریخ اسلام کے ابتدائی دور سے کسی نہ کسی شکل میں شیعہ اسکول موجود ہے لیکن حالیہ ایرانی انقلاب کے بعد اسے عالمی سطح پر کچھ زیادہ ہی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ عام اہل اسلام جو اس طبقہ کے حقیقی معتقدات اور تاریخی طور پر اس کے کردار سے واقف نہ تھے وہ تو اس انقلاب کے پیش نظر کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آنے لگے ہیں لیکن ستم یہ ہے کہ بعض اہل علم و دانش اس انقلاب کو اسلامی انقلاب کہہ کر وکیل صفائی اور مفت کے ترجمان کا فرض ادا کرنے لگے اور اب تک کر رہے ہیں۔ انہوں نے شیعہ معتقدات اور موجودہ انقلاب ایران کے بانی جناب خمینی صاحب کے ذاتی نظریات و افکار وغیرہ سب سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور دنیا کو ایسا باور کرانے پر مشغول ہیں گویا خلافت علی منہاج النبوۃ کا دور واپس آگیا ہے۔

ہمارے یہاں کی ایک نیم سیاسی اور نیم مذہبی جماعت نے اس انقلاب کی اسلامیت کو لوگوں کے حلق سے اتارنے میں خاصا رول ادا کیا ہے اور یہاں کی شیعہ آبادی نے اس انقلاب کی بنیاد پر جس نوع کی حرکات کی ہیں ان سے البتہ بعض لوگ ضرور چونکے ہیں اور ان میں ایک طرح کا تجسس پیدا ہونے لگا ہے کہ معلوم کیا جاسکے کہ شیعہ کی اصل ہے کیا؟ بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، ہمارے یہاں مختلف طبقات کے اختلاف بعض فقہی نوعیت کے ہیں، عقیدہ کا اختلاف ابتدا میں شیعہ اور سنّی کے درمیان ہی ہوا۔ (سانحہ کربلا ص۲۵) اس لئے بھی اس عنوان پر گفتگو ضروری ہے۔

اس مختصر وقت میں یہ تو مشکل ہے کہ شیعہ کے تمام معتقدات پر تفصیلی گفتگو کی جائے لیکن ہم کوشش کریں گے کہ موٹی موٹی تفصیلات عرض کی جاسکیں اور بالخصوص اس انجمن و ادارہ کی مناسبت سے قرآن عزیز کے متعلق شیعہ اسکول کے عقائد و نظریات زیر بحث آئیں گے۔ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ یہ اسکول بنیادی طور پر ایک پولیٹیکل پارٹی ہے جو اسلام کے ابتدائی دور سے مخصوص انداز سے سرگرم عمل ہے۔ قرآن عزیز کی وہ تفصیلات جو اس نے دورِ نبوی کے بگڑے ہوئے یہود اور منافقین کے متعلق نقل کی ہیں انہیں سامنے رکھا جائے تو کل کے نفاق اور آج کے تقیہ میں ایک خاص مناسبت نظر آئے گی۔

حضور نبی مکرم قائدنا الاعظم محمد عربی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وسلامہٗ کی ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں جن لوگوں کے سیاسی مفادات متاثر ہوئے انہوں نے کفار و مشرکین مکہ سے سازباز کرکے مسلمانوں کو جنگی میدانوں میں ختم کرانا چاہا لیکن جب اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد کے سبب ایسا نہ ہوسکا تو انہوں نے اپنی منافقانہ سرگرمیاں تیز تر کردیں اور حضور علیہ السلام کے قتل کے کئی ایک منصوبے تیار کئے تاہم ان کی مشکل یہ تھی کہ وحی الٰہی ان کے ہر پروگرام اور سازش کو طشت از بام کردیتی اور انہیں منہ کی کھانا پڑتی۔

ارتحالِ نبوی کے سانحہ شدیدہ کے بعد انہوں نے مسئلہ خلافت کو بنیاد بنا کر اسلام اور اسلامی جماعت کو سبوتاژ کرنا چاہا لیکن حضرات امامنا الاکبر سیدنا صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی فراست و استقامت نے امت کو اس وار سے بچالیا اور توفیقِ الٰہی نے جناب صدیق کو وہ راہ سلجھائی کہ دشمن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دوران کے لئے اور مشکل کا باعث بنا اور وہ کسی نوع کی سرگرمیوں کا مظاہرہ نہ کرسکے۔ اُدھر ایران میں

ایرانی حکومت ختم ہو کر رہ گئی۔ اور مجوس کا غرور خاک میں مل گیا۔ مدینہ کے یہود اور ایران کے مجوس نے معلوم ہوتا ہے آپس میں گٹھ جوڑ کر کے اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کو ختم کرنے اور اسے روکنے کی کوشش کی، اس مرحلہ پر ایک ایرانی غلام کے ہاتھوں حضرت فاروق اعظم کی شہادت اور اس قاتل کو بابا شجاع کے نام سے شیعہ اسکول میں قومی ہیرو کی حیثیت حاصل ہونا ہمارے خدشات کی بنیاد ہے ـــ عید مباہلہ کے عنوان سے اس دن کو تقریبات دراصل اسی مجوسی غلام زادہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے منائی جاتی ہیں جو حضرت فاروقؓ کا قاتل ہے۔ ایسے ہی ۱۸ ذوالحجہ کو عید غدیر حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خوشی اور امام جعفر کے کونڈے مرگ معاویہ کی مسرت کے طور پر تیار کئے جاتے ہیں۔ (عیاذاً باللہ)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت جن حالات میں ہوئی اور آپ نے جس صبر و حوصلہ اور تحمل و بردباری سے موت کو خوش آمدید کہا وہ حضرت عثمان کا وہ اعزاز ہے کہ باید و شاید اور ظاہر ہے کہ یہاں وہی ہاتھ مصروف کار تھا جو خلافت کو نبی علیہ السلام کے گھرانے کی چیز کہتا تھا۔ اب حالات کی تہہ در تہہ کروٹوں اور بالخصوص ۶۱ھ کے واقعہ کربلا کی افسانوی حیثیت نے اس اسکول کو منظم کر دیا اور اپنی سیاسی حکمت عملی کو انہوں نے مذہب اور مذہبی معتقدات کی آڑ میں پھیلانا شروع کر دیا۔

اسلام سے ان کے تعلق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ بدر میں بطور غنیمت ابوجہل یا منبہ بن الحجاج کی جو تلوار حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلم نے اپنے لئے مخصوص فرمائی جیسا کہ طبقات ابن سعد ص۳۶۸، ج ۱، ص۲۷۲، ج ۲، طبری ص۵۰، ج ۱ اور منہاج السنۃ ص۱۸۱، ج ۳ میں تصریح ہے اسے یار لوگوں نے آسمان سے بواسطہ جبرئیل امین علیہ السلام کی لائی ہوئی تلوار بنا دیا جیسا کہ امام رضا کے حوالہ سے الشافی ترجمہ اصول کافی ص۲۶ ج ۱ میں ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ اس کا قبضہ چاندی کا تھا۔

امامیہ دینیات درجہ اول ص۵ پہ ہے کہ اسلام کو نبی کے بعد ہمارے بارہ اماموں نے برقرار رکھا ـــ شیعہ جن بارہ ائمہ کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں، ان میں سے بارھویں تو ہنوز غائب ہیں اور جب آئیں گے تو بقول ملا باقر مجلسی، سب سے پہلے ان کی بیعت حضور نبی کریم علیہ السلام کریں گے (حق الیقین ص۳۴۷، مطبوعہ ایران) یہ ائمہ وہ ہیں جنہیں خدا نے امام بنایا۔

رسول اکرمؐ نے بتلایا انہیں بھی معجزات ملے اور جو شخص امام کو چھوڑ دے اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی (امامیہ دینیات صـ۱۳ ج ۱) ان کے لئے معصوم ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا معصوم ہونا نبی کے لئے ضروری ہے (امامیہ دینیات صـ۱۷ ج ۲)۔ یہ ائمہ انبیاء، اوصیاء اور ملائکہ سے افضل ہیں (الفصول المہمہ للحر العاملی صـ۱۵۲) اور کتاب الحجۃ من الاصول صـ۱۷۵ ج ۱ پر بھی تصریح ہے کہ امامت نبوت و رسالت سے برتر ہے۔ ایرانی انقلاب کے سربراہ جناب خمینی کی کتاب حکومت اسلامی صـ۳۴ مطبوعہ لاہور میں بھی اس کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل کے ذریعہ حضور علیہ السلام پر لازم کیا کہ وہ حضرت علی کی خلافت کے تعین کا اعلان کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ بقول خمینی صاحب حضرت علی کچھ نہ کر سکے حتیٰ کہ کوفہ کے ظالم قاضی شریح کو بھی معزول نہ کر سکے (حکومت اسلامی صـ۱۱۹) شیعہ حضرات اپنے اس عقیدہ میں اتنا غلو رکھتے ہیں کہ جناب مہدی جو بقول ان کے بارہویں امام ہیں اور اب ان کی عمر گیارہ سو سال ہو چکی ہے ان کی امامت پر قرآن سے دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ جنہیں سے پہلی دلیل سورۂ رعد کی آیت ہے۔ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ اور یہ بات شیعہ دینیات برائے درجہ پنجم کے گیارہویں سبق میں ہے جو ادارہ تنظیم المکاتب پاکستان کراچی نے شائع کی۔

امام آخر کا یہ حال ہے تو امام اوّل کا کیا حال ہوگا! چنانچہ البرہان فی تفسیر القرآن صـ۲۲۶ ج ۴ پر ہے کہ

"حضور علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا" اے میرے رب اپنے بندے علی کے صدقے گنہگاروں کو معاف کر دے ـــــ مزید لکھا ہے کہ نبی کی پیدائش آسمان و زمین کے نور سے ہوئی لیکن علی کی پیدائش عرش و کرسی کے نور سے اور علی عرش و کرسی سے اعلیٰ و افضل ہیں"۔

امامت کے ساتھ حضرت علی کی خلافت کے متعلق بقول شیعہ قرآن کی بہت سی آیتیں اور حضور کی بہت سی حدیثیں ہیں ـــــ اور یہ کہنا کہ آپ انتقال کے وقت کسی کو خلیفہ بنا کر نہیں گئے۔ آپ کی بے داغ سیرت کو داغدار بناتا ہے ـــــ اور یہ کہ جو علی کو نبی کا خلیفہ بلافصل مانے گا۔ خدا اسی کو دوست رکھے گا (امامیہ دینیات درجہ پنجم دسواں سبق)

خلافت و امامت اور ائمہ کی معصومیت کے بعد شیعہ عقائد میں تولّا اور تبرّا

کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس کا مفہوم امامیہ دینیات درجہ اوّل ۲۳ ویں سبق کے بقول یہ ہے کہ تولّا نام ہے خدا، رسول اور امام سے محبت کرنا اور تبرّا ہے ان کے دشمنوں سے نفرت کرنا۔

اب تقیہ کی طرف آئیں جو اس اسکول کا عظیم الشان عقیدہ ہے اور ائمہ فرماتے ہیں کہ

"تقیہ ہمارا اور ہمارے آباء کا دین ہے نیز جس کا تقیہ نہیں اس کا دین نہیں۔"

(الخطوط العریضہ صہ ۵۵ مطبوعہ مدینہ منورہ)

اور "الاسلام سبیل السعادۃ والسلام صہ ۱۰۹ پر ہے کہ جب مکلّف کو اپنے جان و مال میں ضرر کا خطرہ ہو تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ترک کرنا اس پر واجب ہے

آخر میں ہے: وھذا الحکم من مخصصات الشیعۃ ویسمّی بالتقیۃ

اور معصوم بچوں کو پڑھائی جانے والی دینیات برائے درجہ پنجم میں ہے کہ بے دینوں کے سبب دین دار کی زندگی خطرہ میں ہو تو تقیہ کا حکم ہے۔ تقیہ خدا اور رسول کی نظر میں برا نہیں حتیٰ کہ قرآن کریم میں مومن آل فرعون کے واقعہ سے تقیہ پر استدلال کیا گیا ہے۔

(دیکھیں ۲۵ واں سبق)

جناب خمینی صاحب جیسے انقلابی لیڈر بھی اپنے ائمہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ ایسے حالات کا شکار رہے کہ صحیح حکم بیان نہیں کر پاتے تھے اور یہ کہ یہ تقیہ مذہب کی بقا کیلئے تھا۔

(حکومتِ اسلامی صہ ۲۰)

اسی قسم کے اعتقادات اپنا کر یہ گروہ زیرِ زمین مصروفِ عمل رہا اور جب اور جہاں اسے موقع ملا اس نے اہلِ اسلام کی جڑوں پر تبر چلایا۔ خلافتِ بنو عباس سے بھی شیعہ خوش نہ تھے کیونکہ عباسی حضرات کے جدِ اعلیٰ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق رجال کشی صہ ۵۲ پر ہے کہ فَلَبِئْسَ الْمَوْلٰی وَلَبِئْسَ الْعَشِیْرُ کی آیت ان کے حق میں نازل ہوئی۔ اسی طرح مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا ان کے حق میں نازل ہوئی (رجال کشی صہ ۵۲)

اور حضرت عباس کے صاحبزادگان ذوی القدر حضرت عبداللہ اور حضرت عبید اللہ کے متعلق اسی رجال کشی کے صہ ۵۲ پر ہے کہ جناب امیر نے ان پر لعنت کی۔ ان حالات میں اور اس قسم کے نظریات کے بعد ناممکن ہے کہ شیعہ بنو عباس سے راضی ہوں۔ جہاں تک بنو امیہ کا تعلق ہے اسلام کے لئے ان کی خدمات، رسول اکرم علیہ السلام کا ان پر بالخصوص حضرت عثمان، حضرت ابو سفیان، حضرت یزید بن ابی سفیان اور حضرت معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر اعتماد،

پھر خلافت کے مختلف ادوار میں ان کی خدمات اور اربابِ عزیمت کی طرف سے ان کا اعتراف ہونے کے باوصف شیعہ انہیں معاف کرنے کو تیار نہیں ــــ اور وہ تو رہے ایک طرف بنو عباس تک ان سے نہ بچے اور موقعہ ملنے پر شیعہ وزراء نے بغداد اور سلطنت بنو عباس کی تباہی کا پورا سامان کیا جس پر سعدی مرحوم نے المناک مرثیہ لکھا اور کہا کہ ملکِ بغداد کے زوال پر آسمان خون کے آنسو روئے تو بجا ہے۔

پھر اسی پر بس نہیں برعظیم کی سب سے زیادہ شاندار اور مستحکم حکومت اسی طبقہ کی ریشہ دوانیوں کے سبب بربادی کا شکار ہوئی۔ میری مراد مغلیہ سلطنت سے ہے جس کے عظیم المرتبت حکمران غازی اورنگ زیب عالمگیر کے بعد حالات روبہ زوال ہونا شروع ہوئے اس سلسلہ میں سید عبداللہ اور حسین علی جو سید برادران کے نام سے معروف تھے ان کا رول بڑا اہم ہے۔ جنہوں نے کسی بادشاہ کو جب ناپسند کیا تو نہ صرف اسے تخت سے اتر دیا بلکہ بعض کی آنکھوں میں سلائیاں پھروائیں تو بعض کو حوالۂ زنداں کر کے المناک حالات سے دوچار کیا۔ اس خطہ میں ادھر میں ایرانی عقائد و افکار نے جو رنگ جمایا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ جسے چھوٹا ایران کہنا مناسب ہے، کے دو فاضل بزرگ ملا عبدالعلی بحر العلوم اور ملا حسن فرنگی محلی تعزیہ کے ایک قضیہ میں ایسے خارج البلد کئے گئے کہ پھر انہیں سرزمین وطن دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

(زوالِ سلطنتِ مغلیہ ص۱۳، ص۱۶، ص۲۷، ص۲۸)۔

اور اگر آپ تازہ حالات کا جائزہ لیں تو شیعہ اپنے پولیٹیکل مقاصد کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں اس پر آپ کو حیرت ہوگی لیکن یقین جانیں کہ ہمیں ذرا برابر حیرت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری غفلت و مدہوشی نے ہمیں یہ روز بد دکھلایا ہے ــــ اور اب ہم کونسا سنبھل گئے ہیں کہ ہم سوچیں کہ چلو کل تک جو ہوا سو ہوا اب ہم عقل و خرد سے کام لیکر چلیں گے۔

خمینی صاحب جو اس وقت دنیا بھر کی شیعہ آبادی کے قائد و امام کا رول ادا کر رہے ہیں اور جن کے لئے دعائیں مانگی جاتی ہیں کہ وہ امام آخر الزماں کی آمد تک قائم رہیں ان کے ایران سے ترکمانی قبائلی محض سنی ہونے کے جرم میں ظلم سہہ سہہ کر اب روس کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ابتدا میں روس نے انہیں روکا بھی لیکن پھر اپنی سرحدیں کھول دیں اور یہ گویا تاریخ میں پہلا موقعہ ہے کہ روس کی ایران سے ملنے والی ۲۵۳۵ کیلو میٹر لمبی سرحد کھولی گئی ہے

لیکن خمینی صاحب ہیں کہ ٹھنڈے دل سے اپنے آپ کا جائزہ لینے کے بجائے یہ الزام لگا رہے ہیں کہ یہ لوگ کافر اور وحشی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کا بھیس اختیار کر رکھا ہے۔

——— وا حسرتا ! (تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ اکتوبر ۸۳ء)

اور ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ کی اشاعت ستمبر ۸۳ء کے بقول ایران کے سرکاری مہمان خانۂ بزرگ (استقلال ہوٹل) میں ٹھہرے ہوئے بیرونی مہمان اس قسم کے بینر بالعموم دیکھتے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے۔

سَنَتَّحِدُ وَ سَنَتَلَاحَمُ حَتّٰی نَسْتَرِدَّ مِنْ اَیْدِی الْمُغْتَصِبِیْنَ
اَرَاضِیْنَا الْمُقَدَّسَۃَ الْقُدْسَ وَالْکَعْبَۃَ وَالْجُوْلَان۔

کہ ہم متحد ہوں گے اور جنگ آزما ہوں گے یہاں تک کہ غاصبوں کے قبضے میں سے اپنی مقدس زمینیں یعنی بیت المقدس، کعبہ اور گولان واپس لے لیں۔

اور روزنامہ 'جسارت' کراچی کی اشاعت مجریہ ۲۰ اکتوبر ۸۳ء کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو جماعت اسلامی کے اہم رکن خلیل حامدی صاحب کے ارضِ مقدس کے مکتوب سے لیا گیا ہے۔

"۱۴ ستمبر کو یہاں ذوالحجہ کی ۷ تاریخ تھی۔ منیٰ میں روانگی کے لئے درمیان میں ایک دن رہ گیا تھا اس وقت نہ صرف حرم شریف بلکہ ارد گرد کی سڑکیں، راستے اور محلے انسانوں سے بھرے پڑے تھے۔ طواف اور سعی میں شدید ہجوم تھا۔ ان حالات میں دس بجے صبح سے ایرانیوں نے عزیزیہ سے حرم شریف تک ایک جلوس نکالا اور حرم شریف میں اندھا دھند داخل ہو گئے۔ ان کی زبان پر یہ نعرے تھے، امریکہ اور اسرائیل مردہ باد' خمینی راہبر و رہنما، انقلاب انقلاب اور آزادی قبلتین ہدف ما ——— ان لوگوں نے ہاتھوں میں امام خمینی کی تصاویر اٹھا رکھی تھیں"

حامدی صاحب کہتے ہیں کہ:

"یہ چیزیں تاریخِ حرم میں کبھی حرم شریف کے اندر دیکھنے میں نہیں آئیں"۔

سوچیں کہ حرم کے اندر یہ ہنگامہ برپا کرنا اور آزادی قبلتین یعنی بیت المقدس اور مکہ معظمہ کی آزادی اور انہیں کافروں کے تسلط سے آزاد کرانے کے نعرے اور سوچ کس بات کی غماز ہے!

حامدی صاحب کے ایک دوسرے ہم مسلک صلاح الدین صاحب مدیر جسارت نے اپنے دورۂ ایران کی جو یادداشتیں مرتب کی ہیں انہیں انہوں نے بعض ایسے اشارات کئے ہیں جو قابلِ غور ہیں، مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ اب وہاں خمینی صاحب کے محافظوں کی تعداد شاہ کے محافظوں سے دوچند ہے۔ ان کی رہائش گاہ کے چاروں طرف دو دو فرلانگ تک کا علاقہ مکمل طور پر خالی ہے اور یہ کہ عراق ایران جنگ خمینی صاحب نے ضرورت کے تحت جاری رکھی ہوئی ہے تاکہ ایرانی فوجیں مشغول رہیں اور صدام کا تختہ الٹ کر ایک نئی فتح کا کریڈٹ حاصل کیا جائے اور جوشِ انقلاب کو برقرار رکھا جائے۔ نیز انہوں نے لکھا ہے کہ راشن بندی کے جملہ اخراجات آیت اللہ صاحبان کے سپرد کر کے جبر کی مکروہ صورت پیدا کر دی گئی ہے اور سزاؤں میں بے اعتدالی کا ایسا ریکارڈ قائم کیا گیا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی نیز شخصیت پرستی کے جنون نے خمینی صاحب کا فوٹو مسجد کے محراب تک پہنچا دیا ہے اور اللہ اکبر کے ساتھ خمینی رہبر کا نعرہ عام ہے ـــــ اس کے ساتھ انہوں نے شیعہ تعصب کی طرف توجہ دلائی ہے۔
جو ہمارے یہاں کے مداحانِ خمینی کے لئے ایک تازیانہ ہے، مثلاً بقول جسارت انتخابات ہوئے تو سُنّی کردستان اور سُنّی بلوچستان کے اکثریتی علاقے اس حق سے محروم رہے اور تہران جیسے بڑے شہر میں ایک سُنّی مسجد تک نہیں ـــــ اس کے باوجود پروپیگنڈے کے میدان میں کہا جاتا ہے کہ شیعہ اور سُنّی کے درمیان کوئی اختلاف ہے ہی نہیں (بیان خمینی برائے حجاج ص۱۲) ـــــ اور خمینی صاحب ایسی بات کہیں تو تعجب نہیں، تعجب ہے ان لوگوں پر جو خواہی نخواہی وکیل صفائی کے روپ میں دنیا کو گمراہ کر رہے ہیں ـــــ

خلیل حامدی صاحب اور صلاح الدین صاحب کے ایک ہم مسلک نے الحکومۃ الاسلامیہ للخمینی کے ترجمہ کے ساتھ اپنے مقدمہ میں انہیں "حقیقی اسلامی قائد بتایا ہے جو شیعہ سُنّی اختلافات سے بالاتر ہیں۔ (ص۱۳) اور انہوں نے اس " اسلامی انقلاب" کو دنیا بھر کے اسلامی انقلابات کا ہراول دستہ بتلایا ہے جس کے ذریعہ بقول ان کے گلشنِ اسلام میں بہار آگئی ہے (ص۱۳) بقول ان کے ان کا فکری رشتہ علامہ اقبال، مولانا مودودی، حسن البنا شہید سید قطب اور ڈاکٹر علی شریعتی سے ملتا ہے۔ فلہٰذا یہ ہمارا سرمایہ ہے۔ (ص۱۸، ۱۹)
اور اس کتاب میں ص۲۸ پر یہ بھی اظہار کیا گیا ہے کہ علامہ خمینی کی اسلامی تحریک مکمل اور جامع اسلامی تعلیمات کی علمبردار ہے۔ جس اسکول کے خمینی صاحب نمائندہ بلکہ عالمی قائد ہیں

اس کے عقائد کی ایک جھلک آپ نے ملاحظہ فرمائی اور قرآن عزیز کے متعلق ان کے تصورات ابھی آیا چاہتے ہیں پھر ان کا ملک و بیرون ملک کردار اور کعبۃ اللہ کی آزادی کے نعرے دیکھنے اور سننے کے بعد انہیں اسلامی انقلاب کا قائد کہنا عجیب سی بات ہے جس کی توجیہ ہماری سمجھ میں کم از کم نہیں آتی۔

اسرائیل کے خلاف ان کے نعرے تو بہت ہیں لیکن موجودہ جنگ میں ایران اسرائیل گٹھ جوڑ کا آسانی سے انکار ممکن نہیں۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور کی اشاعت مجریہ ۲۲ اپریل ۸۴ء میں عربی ہفت روزہ المجلہ کے ایک مضمون کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ وہ مضمون اس حقیقت کا مظہر ہے کہ درپردہ کس طرح اسرائیل ایران ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں ــــــ امریکی ٹی وی ایرانی وفد اور اسرائیلی وفد کی ملاقات کے بارے میں بتلاتا ہے کہ اس ملاقات میں پچاس ملین ڈالر کی رقم کے اسلحہ کا سودا طے ہوا۔ (ص۱۱) عراق ایران جنگ کے ایک کمانڈر جنرل صیاد شیرازی اور اسرائیلی ریٹائرڈ جنرل یعازی کے تعلقات کا چاروں طرف چرچا ہے۔ جنرل یعازی ہی کو اسرائیل نے عراق کے خلاف جنگی امور میں ایران کی مدد کے لئے بھیجا تھا۔ (ص۱۱)۔ عراقی ایٹمی پلانٹ کی تباہی کے سلسلہ میں اسرائیل کے کردار کا پورے یورپی اخبارات میں چرچا ہے (ص۱۲) اور ایرانی قیادت اسرائیل سے اسلحہ وغیرہ جو لے رہی ہے تو اس لئے کہ شاہ کے زمانہ کا جو قرض اسرائیل کے ذمہ ہے اس کی وصولی کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ (ص۱۲)

یہ ہے اسرائیل مردہ باد کے نعرے کی حقیقت۔ اسرائیل ایران کی باہمی دشمنی کی کوئی وجہ نہیں، جس طبقہ نے صدرِ اسلام میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف مبارزت اور دشمنی کا وطیرہ اختیار کیا۔ ان کے اخلاف ہونے کا دعویٰ موجودہ یہود کو ہے اور جو لوگ یہود کے کیمپ سے مفادات کے پیشِ نظر اسلام کے دعویدار ہوئے ان کے اخلاف کون ہیں؟ ہم یہ بتلا چکے، اس لئے ان دونوں مملکتوں کا آپس میں قارورہ مل جانا تعجب انگیز نہیں۔ ان عقائد و افکار کے ساتھ جماعت صحابہؓ کا جہاں تک حال ہے تو عقیدۃ الطحاوی ص۱۴ مطبوعہ لاہور کے بقول

"تمام صحابہ کرام کی محبت ہمارا دینی اور اسلامی فرض ہے لیکن اس طرح کہ کسی کی محبت میں حد سے نہ بڑھیں انہیں نیکی کے ساتھ یاد کریں۔ ان کے دشمنوں اور عیب جوؤں کو اپنا دشمن تصور کریں۔"

لیکن شیعہ حضرات: اِنَّ النَّاسَ کُلَّھُم ارتدوا بعد رسول اللہ غیر اربعہ (کتاب سلیم بن قیس

العامری صد۹۲ مطبوعہ بیروت) کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سب رسول اللہ کے بعد مرتد ہوگئے (معاذ اللہ) بلکہ کتاب الروضہ من الکافی صد۲۴۵، ج ۸ میں محض تین کا اسلام پر رہنا لکھا ہے باقی سب بقول کلینی اہل ردہ تھے اور جناب ابوبکر و عمر کو جبت و طاغوت کے نام سے یاد کرتے ہیں (تنقیح المقال فی احوال الرجال صد۲۰۷، ج ۱ مطبوعہ ۱۳۵۲ھ نجف اشرف) صحابہ علیہم الرضوان کے خلاف تو ان لوگوں کے نظریات ہیں ہی، ان کے مفروضہ اہل بیت بھی ان کی زبان درازیوں سے نہیں بچے۔ کتاب الروضہ میں جناب عباس و عقیل کو ذلیل کہا گیا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت علی کو جبن و بزدلی کا طعنہ ان لوگوں نے دیا۔ (الامالی للطوسی صد۲۵۹ و حق الیقین للمجلسی صد۲۰۳) —— گویا نہ صحابہ کو بخشا نہ اہل بیت کو۔

جب اسلام کی باوقار شخصیات کے خلاف ان کا طرزِ عمل یہ ہو تو پھر بھائی چارگی اور باہمی تعلق کیسا؟ اسی لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے الفرقان لکھنؤ جون ۱۹۸۱ء کے ایک مضمون میں واضح کیا کہ شیعہ حضرات اگر خلوص دل سے اسلامی فرقوں کے قریب آنا چاہتے ہیں تو صحابہ اور امہات المومنین کے متعلق انہیں اپنا طرزِ عمل بدلنا ہوگا کیونکہ افراد اور جماعتوں کی محبوب و محترم شخصیات کے احترام کے بغیر باہمی تعاون کا سوال ہی نہیں لیکن مسئلہ محض ان محبوب شخصیات کے احترام کا ہی نہیں بلکہ اسلام کی بنیاد قرآن حکیم کا سب سے اہم ہے جن کے متعلق شیعہ کہتے ہیں:

"اس کا پورا علم صرف پیغمبر اور ان کے اہلبیت کے پاس ہے اور کسی کے پاس پورا علم نہیں"۔ (امامیہ دینیات ج ۲ صد۱۰)

قرآن عزیز کے متعلق علامہ ابن حزم ظاہری لکھتے ہیں:

> قدیم و جدید دور میں شیعہ کا مجموعی مزاج اور قول یہی رہا ہے کہ قرآن بدل دیا گیا ہے۔ اس میں کمی و بیشی کثرت سے کی گئی ہے۔ (الملل والنحل صد۱۸۲، ج ۴)

آج شیعہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ قرآن کو جامع اور مکمل کلام مانتے ہیں۔ اس میں تحریف کے قائل نہیں اور سادہ لوح سنی بھی ان کے اس مغالطہ کا شکار ہیں۔ کئی شیعہ ذاکرین و واعظین کے نام کے ساتھ حافظ کا سابقہ بھی اس مغالطہ کو تقویت پہنچاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس عقیدہ کا اظہار کہ قرآن محرف نہیں تقیہ کی گرم بازاری ہے اور شیعہ کی مجبوری —— اس فرقہ کی اہم کتاب فصل الخطاب صد۲۷ میں واضح کیا گیا ہے:

> "اصل قرآن پڑھنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا اور مخالفین کو بھڑکانا ہے اس لئے ائمہ نے اصل قرآن پڑھنے سے منع فرمایا۔"

اسی طرح محدث الجزائری کی کتاب انوار النعمانیہ صد۲۱۸ طبع قدیم پر ہے کہ:

"ائمہ نے اس قرآن کو پڑھنے کا امام مہدی تک حکم دیا ہے وہ آئیں گے تو یہ قرآن اٹھ جائیگا اور حضرت علی کا جمع کردہ قرآن امام مہدی ظاہر کریں گے۔"

اور تفسیر مراۃ الانوار صـ۳۶ اور صـ۳۸ پر بھی اسی طرح کی روایات ہیں کہ امام مہدی کے ظہور تک اسی قرآن سے کام چلاؤ ورنہ گڑبڑ ہوگی۔ یہ بات اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ شیعہ اس اصلی اور حقیقی قرآن کو مجبوراً اور تقیۃً پڑھتے ہیں ورنہ اصل قرآن یہ نہیں وہ تو امام مہدی کے پاس ہے وہ آئیں گے تو اسے لائیں گے۔

حضرت علی نے جو قرآن جمع کیا تھا وہ موجودہ قرآن سے کئی گنا زیادہ ہے اور تحریف سے بالکل پاک۔ (انوار نعمانیہ محدث الجزائری صـ۲۷۴)

علماء اہل سنّت نے بڑی محنت سے ان شیعہ علماء کی فہرست مرتب کی ہے جو تحریف قرآن کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

خود شیعہ عالم علّامہ طبرسی نے متعدد علماء شیعہ کے نام لکھ کر آخر میں لکھا ہے: وھو مذھب جمھور المحدثین الذین عثرنا علی کلماتھم (فصل الخطاب صـ۲۵)

اور اس موضوع پر ۱۲ انتہائی اہم کتابیں شیعہ نے لکھی ہیں جن میں سے بعض تحریف ہی کے مسئلہ پر ہیں تو بعض کا اکثر حصّہ اس مسئلہ کے متعلق انہیں فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب علامہ نوری طبرسی۔ کتاب التحریف احمد بن محمد بن خالد برقی کتاب التنزیل والتحریف شیخ حسن بن سلیمان علی، کتاب قرأۃ امیر المؤمنین ابو طاہر عبدالواحد بن عمر قمی وغیرہ بڑی اہم ہیں۔ اور ہزار کوششوں کے باوجود شیعہ ان کتابوں کو ناپید نہیں کر سکے ـــــ لفظی تحریف جس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔ اس کے ساتھ معنوی تحریف کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس کا شیعہ کتابوں میں ذکر ہے۔

مثلاً سورۂ نساء کی مشہور آیت جس میں مشرک کو نہ بخشنے اور مشرک کے ماسوا گناہوں کی بخشش اپنی مرضی پر چھوڑ دی ہے۔ اس میں تفسیر عیاشی صـ۲۴۵ ج ۱ مطبوعہ تہران میں لکھا ہے کہ اللہ اس کو نہیں بخشے گا جس نے حضرت علی کی ولایت و امامت کا انکار کیا۔ گویا عقیدہ توحید حضرت علی کی ولایت و امامت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

معنوی تحریف میں سورۂ مائدہ کی آیت یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ کے متعلق تفسیر فرات بن ابراہیم صـ۶۳ میں ہے کہ جس چیز کے پہنچانے کا حکم اللہ نے دیا وہ حضرت علی کی

خلافت و امامت ہے اور مناقب شہر بن آشوب صـ۱۰۷ ج ۲ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے تفسیر البرہان صـ۲۰ ج ۴ میں وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرَاهِیْمَ کا معنی لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام علی کے شیعوں میں سے ایک شیعہ تھے۔ اور تفسیر مراۃ الانوار صـ۳۰۱ پر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے جو کلام کیا وہ ولایتِ علی سے متعلق تھا۔ اسی تفسیر کے صـ۲۵۸ ج ۱ میں ہے کہ قرآن کے الفحشاء والمنکر سے مراد ابوبکر و عمر ہیں اور البغی سے مراد عثمان غنی اور اسی صفحہ پر ہے کہ فحشاء منکر۔ بغی۔ خمر۔ میسر، ازلام، انصاب، اوثان، جبت، طاغوت، میتہ، دم، لحم خنزیر ان سب الفاظ سے صحابہ رسولؐ مراد ہیں۔ اور صـ۱۰۱ ج ۱ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا کہ ہمارے دشمنوں یعنی سُنّیوں کی نیکیاں لے کر شیعوں کو دیدو اور محبانِ اہلِ بیت کی بدیاں سُنّیوں کو دے دو اُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ کا یہی مفہوم ہے ـــ الغرض اس طرح کی معنوی تحریفات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ جو ان شیعہ کتب میں بکھرا ہوا ہے جواب بھی چھپ رہی ہیں اور برابر ان کی اشاعت ہو رہی ہے۔

شیعہ کے نزدیک قرآن کی آیات سترہ یا اٹھارہ ہزار تھیں (فصل الخطاب صـ۲۳۸) جبکہ اسی کتاب کے بقول موجودہ قرآن ۶۲۳۶ آیات کا ہے (صـ۱۹۲) قرآن کو صحابہ سے پوشیدہ رکھنے میں بقول شیعہ کئی بہتریاں ہیں۔ قرآن کا ان کے حوالے کر دینا دشمن کو ہتھیار دینے کے مترادف تھا اس لئے ان سے چھپا کر رکھا اصل نسخہ امام غائب کے پاس ہے (صـ۱۵ فصل الخطاب) انوارِ نعمانیہ صـ۱۴۷ پر ہے کہ مسجد میں نازل ہونے والا قرآن حضرت عثمان وغیرہ لکھتے گھر میں نازل ہونے والا صرف حضرت علی ـــ اور موجودہ قرآن محض حضرت عثمان والا ہے۔ کلینی جیسے معتبر شیعہ عالم کی کتاب کافی صـ۶۳۴ ج ۲ پر بھی قرآن کی سترہ ہزار آیات کا واضح ذکر ہے یہ روایت کلینی نے کتاب فضل القرآن میں نقل کی اور واقفین حال جانتے ہیں کہ کافی شیعہ کے نزدیک معتبر ترین کتاب ہے اور اس کی بات بڑی وزنی ہے، قرآن کی تحریف اور تبدیلی کے بارے میں شیعہ کے بڑے بڑے اکابر و مشائخ کے اس ضمن میں جو اقوال ہیں انہیں الشیعہ والقرآن مطبوعہ لاہور ۱۹۸۳ء میں تفصیل سے دیکھا جاسکتا ہے۔ کیا محدث اور کیا مفسر کیا علماء کلام اور کیا دوسرے سبھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور یوں یہ ان کا اجماعی عقیدہ ہے اور اس ضمن میں ہم بعض کتابوں کا پہلے ذکر کر چکے ہیں جن میں فصل الخطاب فی

تحریف کتاب رب الارباب سب سے زیادہ اہم ہے جس کے مصنف نے تحریف قرآن پر اتنی کھل کر گفتگو کی ہے کہ کوئی شیعہ اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا اور اگر کسی میں جرأت ہے تو فیصلہ کرنا ہوگا کہ اس کا مصنف کون تھا ؟ اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ مشہور شیعہ عالم السید نعمت اللہ الجزائری سے منقول ہے کہ وہ روایات جو قرآن کریم کی کمی زیادتی سے متعلق وارد ہیں ان کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے (الشیعہ والقرآن ص۱۶۴)

نامناسب نہ ہوگا کہ یہ بھی عرض کر دوں کہ قرآن عزیز کی ۱۱۴ سورتوں میں سے ۹۹ سورتوں کے متعلق شیعہ عمائدین کی کتب میں متعدد روایات مندرج ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ انہیں کیا کیا کمی بیشی ہوئی ۔

پہلی سورۃ الفاتحہ ہے جسے عام سے عام مسلمان جانتا ہے ۔ اس میں بقول تفسیر قمی اھدنا الصراط المستقیم صراط من انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم وغیر الضالین الخ کا جملہ تھا اور ایک روایت کے مطابق اھدنا الصراط المستقیم کے ساتھ صراط الانبیاء وھم الذین انعم اللہ علیھم غیر المغضوب علیھم الیھود وغیر الضالین النصاری پوری آیت تھی مجموعی طور پر ۴ روایات ہیں جو صرف الفاظ کی کمی بیشی پر دلالت کرتی ہے ۔

سورۃ العصر کی ۶ روایات میں سے ایک یہ ہے والعصر ان الانسان لفی خسر وانہ فیہ الی آخر الدھر ۔

سورۃ کوثر کے متعلق ہے : انا اعطینٰک الکوثر فصل لربک وانحر ان شانئک عمرو بن العاص ھو الابتر ۔

گویا حضور علیہ السلام کے مخصوص صحابی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہاں دشمن نبی بنا دیا گیا ہے ۔

سورۂ اخلاص جیسی مشہور و عام سورۃ کے متعلق ۴ روایات میں سے ایک یہ ہے

قل ھو اللہ احد لا الہ الا اللہ الواحد الصمد ـــــ وفی آخرہ کذالک اللہ ربنا کذالک ربنا ورب آبائنا الاولین

چند مختصر سورتوں کے متعلق ان نمونہ کے حوالہ جات سے اس اسکول کی ذہنیت کا اندازہ ہو جانا چاہیئے کہ ان کے نزدیک اس قرآن کی کیا حقیقت ہے ! یہی وجہ ہے

کہ السیّد محب الدین الخطیب المرحوم نے نہایت جامعیّت کے ساتھ شیعہ عقائد پر مشتمل ایک مختصر رسالہ مرتب کیا جس میں قرآن کریم، حدیث، صحابہ، عقیدۂ توحید، رؤیتِ باری، علمِ غیب، آلِ رسول، شریعت و حقیقت، فقہ، جلاء، تقیہ، امامت جیسے بنیادی مسائل پر تقابلی انداز میں روشنی ڈالی اور بتایا کہ جب بنیادوں میں اتنا تضاد ہو تو پھر باہمی اجتماع کی کیا کیا صورت ہو سکتی ہے؟

برِعظیم میں حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبد العزیز، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا خلیل احمد سہارن پوری جیسے اکابر و اعلام نے انہی عقائد و نظریات کی بنیاد پر اس اسکول کے متعلق بسط و تفصیل سے کتابیں لکھیں اور بتلایا کہ اہلِ سنّت و اہلِ تشیع میں کتنا بُعد و تضاد ہے۔

لیکن وہ بزرگ جس نے سب سے پہلے شیعہ کے عقیدہ تحریف قرآن پر مدلل گفتگو کی اور باقی علماء داعیان کو بھی توجہ دلائی وہ امام اہلِ سنّت مولانا عبد الشکور لکھنوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔

مولانا المرحوم نے لکھنؤ جیسے شہر میں مدّتوں نہایت جرأت و پامردی سے شیعی مزعومات کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ مولانا نے ایک مفصّل فتویٰ مرتّب کیا جس میں تبلایا کہ شیعہ کی معتبر کتابوں میں دو ہزار سے زائد روایات تحریف قرآن کے سلسلہ میں موجود ہیں۔ یہ تحریف کمی بیشی، تبدل حروف، خرابی ترتیب سورتوں، آیات اور کلمات کی ترتیب میں گڑبڑ گویا یہ پانچ قسم کی تحریف ان روایات سے ثابت ہے اور یہ کہ شیعہ عمائدین انہیں متواتر روایات کہتے اور انہی کے مطابق اعتقاد رکھتے ہیں۔

مولانا نے جس تحقیق و تدقیق سے یہ تفصیلات فراہم کیں ان پر علماء نے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا اور ان کی تحریری تائید کی ان تائید کنندگان میں مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیری، مولانا السیّد حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے عمائدین شامل تھے۔ یہ ۱۳۴۸ھ یعنی آج سے ۵۶ سال قبل کی بات ہے۔ اس وقت شیعہ کسی حکومت و سلطنت کے مالک نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس قسم کی تصنیفات تیزی سے شائع کر رہے تھے

جس کا علماء کو مجبوراً سخت نوٹس لینا پڑا۔ آج جبکہ خالص مذہبی بنیادوں پر ان کی ایک حکومت قائم ہے جو اس طرح کا رویہ اپنائے ہوئے ہے کہ گویا ہر جگہ کافر مسلط ہیں اور ان کو نیچا دکھانا اس کا فرض ہے تو اہلِ سنّت کا اجتماعی فرض ہے کہ وہ اپنی ذمّہ داریوں کا احساس کریں اور کتاب مقدّس کی حفاظت وصیانت اور اس کی اشاعت وترویج کے سلسلہ میں جو ذمّہ داریاں ان پر ہیں انہیں پورا کریں۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کی اصل محافظ خود اس کو اتارنے والی ذات ہے اور وہ ظلمت کدہ ہند میں سکھ گھرانوں میں مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا احمد علی لاہوری جیسے افراد پیدا کر کے اپنی کتاب کی خدمت لے سکتی ہے تو آج بھی کسی اور کو کھڑا کر دینا اس کے لیے مشکل نہیں اور اس قسم کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مدعیانِ دین غفلت کا شکار ہو جائیں ـــــ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ اقلیت جس کی آبادی یہاں دو فیصد سے زائد نہیں وہ تو اتنی جری اور منہ زور ہو کہ سب کچھ کر گذرے لیکن ۹۸ فیصد مدعیانِ اسلام و دین ایسے غافل ہوں کہ انہیں نہ اپنے دین کا احساس ہو نہ آسمانی کتاب کا۔

وہ لوگ بلاشبہ مستحق تبریک ہیں جو اس دورِ فتن میں دعوت وعزیمت کی کٹھن راہ اپنائے ہوئے ہیں۔ اے کاش ہر سُنّی کلمہ گو کو یہ احساس نصیب ہو جائے، اگر ایسا ہوا تو پھر شرق وغرب میں ہمارا غلغلہ بلند ہوگا۔ اور ہم اپنی حیاتِ اجتماعی کے المناک دور سے نکل کر ایک روشن اور خوش گوار دور میں داخل ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ حسنِ عمل کی توفیق دے۔

بقیہ: الٓمٓ

۱۳ کے مطابق رکھا:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے دین پر چلنے اور عمل کرنے میں استقامت عطا فرمائے۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم
ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

سیرۃ الخلیل

باب اوّل عنوان خامس

قدرت کا جوشِ رحمت یا اتمامِ حجّت (۱)

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

ہر چند کہ انسانی اعمال خیر و شر طبعی طور پر تعمیر و تخریبِ عالم کی کارگزاریوں میں لگے رہتے ہیں اور عام حالات میں اپنے اپنے مناسب انجام پر پہنچنے کے لئے بالکل کافی تمام قدرت کے ارادۂ غالبہ اور مشیّت قاہرہ کی دسترس سے باہر ہرگز نہیں۔

ہر چیز کی طبیعت قدرت کی پیدا کردہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اپنے آثار و خواص کی بدولت اپنے کل ماسوا سے الگ اور متمائز ہے لیکن کسی بھی اثر یا خاصیت کی جلوہ نمائی میں "اذنِ الٰہی" سے مستغنی اور بے پروا قطعاً نہیں۔ امام غزالیؒ "المنقذ من الضلال" میں طبیعیات پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

> "ان سب کا اصل اور خلاصہ یہ ہے کہ تم اس بات کو سمجھو کہ طبیعت اللہ تعالیٰ کے ارادے کی تابع ہے وہ خود کچھ نہیں کرتی بلکہ اپنے خالق کی طرف سے کام میں لائی جاتی ہے اور سورج، چاند، ستارے اور طبیعتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسی کے لئے مسخر ہیں ان کا خود کوئی عمل نہیں۔"

کائنات کی اس دنیا میں کیا اعیان و کیا اعراض، سب کے سب اپنی صفات کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت سے معروف و مشہور چلے آرہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے درمیان باہمی ملازمت کا یہ تعلق اور رشتہ اس حد تک غیر منفک ہے کہ اس کے تخلّف سے کوئی محالِ منطقی لازم آتا ہے۔ اس طرح کا کہنا اور سمجھنا تو نہ صرف یہ کہ استقراءِ ناقص پر مبنی ہونے کی وجہ سے دعوائے بلا دلیل ہے بلکہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ کی نسبت وہ مجرمانہ سوءِ ظن ہے جو اس کی ہمہ بینی و ہمہ گیری کا اعتقاد رکھنے والے کسی بھی خدا پرست کو زیب نہیں دیتا۔

اشیاء کے آثار و خواص کی نوعیّت اور ان کا ظہور قدرت کے شئونِ مختلفہ کا مرہونِ منّت

ہے۔ بار ہا کسی چیز سے اس کی معروف خصوصیات کا جدا ہونا، یا اس کے بالکل برعکس ایسی ایسی بظاہر غیر متعلقہ صفات کا ظاہر ہو جانا سنا اور دیکھا گیا ہے جن سے سالہا سال کی تحقیق کا ثبوت اور دیدہ ریزیوں سے ڈھونڈھ نکالے ہوئے، علت و معلول کے بے شمار فلسفی ضابطے ٹوٹ ٹوٹ کر چشم زدن میں بے کار ہو جاتے ہیں۔

آگ اور تپش و حرارت کی ملازمت اپنی شہرت اور بداہت کی وجہ سے ضرب المثل قرار پائی ہے۔ عقل و نقل کی خصومت میں عقل کی بھرپور وکالت کرنے والے فلاسفہ تپش و حرارت کو گویا آگ کی ماہیت میں داخل سمجھتے ہیں اور آگ بلا حرارت کا تصور تک نہیں کر سکتے، اسی طرح سے ایک چوبی عصا ـــــــ بے جان جماد ـــــــ سے کسی حیوانی عمل کا سرزد ہو جانا ان کی دنیا میں وہ ناممکن ہے جس کو ممکن کہنا اپنی خیرہ عقلی کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ لیکن واقعات کی شہادت نے ان کے اس تفلسف کو وہ موسوی طمانچہ رسید کیا ہے جس نے اس کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں چھوڑی ہے۔

بھلا! آتش نمرود یا عصائے موسیٰؑ کے وجود میں شک کہ ایسا کوئی واقعہ سرے سے موجود ہی نہیں یا اس کے آگ اور عصا ہونے میں تردد کہ دیکھنے والے اگرچہ قائل ہوئے لیکن فی الحقیقت یہ چیز ہی کچھ اور تھی، اوّل الذکر ایک اعلیٰ درجہ کے تواتر کا انکار ہے اور ثانی الذکر بداہت کاملہ پر عدم اعتبار، اور دونوں میں ایک بھی حکماء کے نام سے موسوم بھاری بھرکم شخصیات تو کیا، ایک معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان کے شایانِ شان بھی نہیں لیکن تُف ہو اس برخود غلط فلسفے پر جو عقل و دانش کا لبادہ اوڑھ کر بے عقلی ـــــــ شرمناک بے عقلی ـــــــ کا پرچارک بنا ہُوا ہے[1]

---

[1] فلاسفہ کی اس فکری غلطی کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ حقائق الاشیاء کی دریافت کے سلسلے میں تحلیل و تجزیے کے جس عملیئے کو روبکار لاتے ہیں۔ اس کے نتائج کو فیصلہ کن سمجھتے ہیں حالانکہ اس میں کچھ مزید کھوج لینے کی کافی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ مثلاً کسی جسم کی حقیقت معلوم کرنی ہو تو طبیعین مادہ و صورت اور مناطقہ جنس و فصل کی تقسیم و تفریق سے اس کی کنہ و حقیقت تک رسائی کی کوشش کریں گے۔ حالانکہ یہ دونوں انداز تحقیق غیر قطعی ہیں۔ اوّل الذکر تو اس لیے کہ خود حکماء ہی کی ایک جماعت جسم کو مادہ و صورت سے نہیں بلکہ اجزائے لاتجزیٰ سے مرکب مانتی ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں (باقی اگلے صفحہ

خوارق ـــــ معجزات ـــــ کے امکان پر بحث کرتے ہوئے علامہ شاطبیؒ "الاعتصام" میں لکھتے ہیں :

" انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری سے قبل انسان اپنے ماحول میں چونکہ اسباب د

وتسلسل، جوان دونوں صورتوں کو تسلیم نہیں کرتے کیا کسی عمل کے ٹھیٹھ عقلی ہونے کی صورت میں اس کے نتائج میں اس قدر بُعد واختلاف پیدا ہونا ممکن ہے اور ثانی الذکر اس لئے کہ اولاً تو جیسے کہ امام غزالیؒ نے "معیار العلم" میں لکھا ہے، جنس وفصل وغیرہ کی تقسیم وتفریق خاصہ مغالطہ انگیز کام ہے بصفات کا باہمی امتیاز اور ذاتی وعرضی کی درجہ بندی اس قدر دشوار گزار گھاٹی ہے جسے سلامتی کے ساتھ عبور کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں اور ثانیاً جیسے کہ امام ابن تیمیہؒ نے " الرد علی المنطقیین " میں غزالیؒ کے مذکورہ کلام پر اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سرے سے جنس فصل وغیرہ کی تقسیم ہی غیر حقیقی ہے کیونکہ ان اجزائے ذہنی کا اجزائے خارجی پر منطبق ہونا کوئی ضروری نہیں علوم عقلیہ کے اسی التباس اور نارسائی کی وجہ سے ایک مدت تک ان کی پُرجوش حمایت وعلمبرداری کرنے والے بہت سے فضلاء کو بھی بالآخر مختلف تعبیرات سے ان کے عجز ودرماندگی کا اعتراف کرنا پڑا۔ ابوعبداللہ الخطیب، جوینی، ابوالحسن بصری، شہرستانی، رازی اور ابن ابی الحدید جیسے بڑے بڑے ناموروں کا یہی حال رہا ہے اور جبکہ ان داخلی کمزوریوں کے علاوہ منطق وفلسفہ امت کی اعتقادی گمراہیوں کا سبب بھی بن رہے تھے جیسے کہ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے " ردّ مختار " میں فتاویٰ ابن حجرؒ سے نقل کرکے بالخصوص فلسفہ کے متعلق اس کو عام تجربہ بتلایا ہے، تو علامہ ابن صلاحؒ اور ان کے ہم مشرب بزرگوں نے ان کا راستہ روکنے کے لئے اس کے خلاف فتوے دیئے، فلسفہ کے بارے میں ابن صلاحؒ نے فرمایا

" فلسفہ بیوقوفی کی بنیاد ہے ضعف وانحلال کی جڑ ہے۔ تحیّر وگمراہی کا خمیر ہے۔ الحاد وزندقہ کے فتنوں کو ابھارنے والا ہے جس نے بھی فلسفہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اس کی بصارت زائل ہوگئی اور اس کی بصیرت سے اس شریعت پاک کے محاسن یکسر اوجھل ہوگئے جس کو کھلے ہوئے اور واضح دلائل کی حمایت حاصل ہے۔"

اور منطق کے بارے میں فرمایا :

" یہ حصولِ فلسفہ کا سبب ہے اور شر کے سبب اور ذریعہ کو بھی شر ہی کہنا چاہیئے۔"

(بحوالہ عقلیاتِ ابنِ تیمیہؒ)

مسببات کا ایک مسلسل نظام مشاہدہ کرتا چلا آتا ہے اور کسی خارجی قوت کے تحت اس کے محکوم ہونے کا اس کو تصور تک نہیں ہوتا اس لئے وہ ان کے درمیان عقلی لزوم سمجھنے لگتا ہے اور اس لئے وہ خرقِ عادت کو محال کہہ دیتا ہے لیکن جب انبیاء علیہم السلام تشریف لا کر کچھ خوارقِ عادات بھی ظاہر فرما دیتے ہیں تو اب اسباب کا راز فاش ہو جاتا ہے اور ایک جدید علم بڑی آسانی کے ساتھ یہ حاصل ہو جاتا ہے کہ ان امورِ عادیہ کے درمیان لزوم عقلی کچھ بھی نہ تھا۔ یہ صرف صانع حقیقی کی خالقیت کا ایک کرشمہ تھا جب اسباب میں تاثیر اسی نے پیدا فرمائی تھی تو یقیناً وہ اس کے سلب کرنے پر بھی قادر ہے۔ بھلا یہ کون ثابت کر سکتا ہے کہ آتش کا جلانا ایک دائمی تجربہ کے سوا کسی عقلی دلیل کا تقاضا ہے۔ لہٰذا جیسے امورِ عادیہ کے درمیان یہ ارتباط کسی عقلی دلیل کا تقاضا نہ ہوا تو اب خرقِ عادت کو بھی محال ٹھہرانا غلط ہے۔"

(بحوالہ مقدمہ ترجمان السنۃ جلد سوم)

علامہ شاطبیؒ کی اس عبارت کا ملخص یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی بھی چیز مؤثر بالذات تو ہے نہیں البتہ اپنی صفات کے اظہار میں سبب کا درجہ رکھتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اصل علت حرکت کناں نہ ہو اسباب کا عمل موقوف رہتا ہے۔ تخلیق بالاسباب اللہ تعالیٰ کی عادت ضرور ہے لیکن مجبوری ہرگز نہیں، اظہارِ قدرت کی اس ایک صورت کے سوا اور بھی صورتیں ممکن بلکہ عملاً واقع ہیں۔ قدرت عادت کی نہیں ہاں عادت قدرت کی محتاج ہے۔ اسی بات کو مؤلف "تفسیر المنار" نے کچھ زیادہ اختصار اور وضاحت کے ساتھ یوں بیان فرمایا ہے:۔

"معجزہ کی حقیقت کے متعلق سب سے زیادہ مشہور اور تحقیقی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عادی نظام کے خلاف صرف اپنی قدرت سے ظاہر فرماتا ہے تاکہ یہ ثابت کر دے کہ نوامیس طبعیہ خود اس کے محکوم ہیں وہ ان کا محکوم نہیں جس طرح وہ چاہے ان میں تصرف کر سکتا ہے۔" (حوالہ بالا)

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "الانتباہات المفیدہ" میں اس سے بھی زیادہ مختصر اور مدلل انداز اختیار فرمایا ہے۔

"قادرِ مطلق نے جس طرح خود اسباب طبعیہ کو بلا اسباب طبعیہ کے پیدا کیا ہے ورنہ تسلسل لازم آوے گا اور وہ محال ہے اسی طرح ان کے مسببات کو بھی اگر چاہیں بلا اسباب طبعیہ پیدا کر سکتے ہیں۔"

اساطینِ ملت کی یہ خیال آرائیاں اپنی جگہ پر بڑی وقیع اور قیمتی ہیں لیکن ہمارے نزدیک خوارق کی توجیہہ میں اس سے بھی زیادہ عمدہ وہ طرزِ فکر ہے جو علوم قاسمیہ کے شارح و ترجمان دارالعلوم دیوبند کے ایک قابلِ فخر فرزند علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اختیار فرمایا ہے۔ اپنے ایک رسالے "اسلام اور معجزات" میں معجزات پر اعتراض کرنے والوں کا جواب دیتے ہوئے اولاً تو دوسرے اہلِ علم کی طرح عادت اور قدرت کے فرق ہی سے اس عقدہ کو سلجھانے کی کوشش فرماتے ہیں اور پھر اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر خوارق کو عادت ہی کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ رقمطراز ہیں :۔

"قدرت اور عادت کی اس تفریق کے وقت ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہئے یعنی جیسے کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں، عادت کی بھی دو قسمیں ہیں

۱۔ عادت مستمرہ عامہ

۲۔ عادت مؤقتہ خاصہ

عادت مستمرہ عامہ سے میری مراد وہ عادت ہے جس کا استعمال بکرات و مرات جلد جلد اکثر و بیشتر اوقات میں ہوتا رہتا ہے اور اس کے بالمقابل عادتِ مؤقتہ خاصہ وہ ہوگی جس کا تجربہ گاہ بگاہ نادر مواقع میں ہوا کرے۔

مثلاً ایک شخص کو ہم دیکھتے ہیں کہ بڑا نرم خو حلیم الطبع اور بردبار ہے۔ ہزاروں گالیاں سننے اور اشتعال دلانے پر بھی غصہ نہیں آتا لیکن اس کے باوجود بارہا یہ تجربہ بھی کیا گیا ہے کہ جب کبھی مذہب پر حملہ ہوا یا اس کے سامنے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی ادنیٰ سی توہین کی جائے اس وقت غصہ سے بے تاب ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے تو توہین کے وقت اس کی یہ سخت گیری اور درشتی اگرچہ اس کی عام عادت (بردباری، عفو و درگزر) کے مخالف ہے لیکن وہ بجائے خود اس کی ایک خاص اور مستقل عادت ہے جس کے تجربہ کا موقعہ گاہ بگاہ اس کے اسباب مہیا ہونے پر ملتا رہتا ہے۔

یاد رکھو! جس چیز کا نام ہم معجزہ رکھتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک فعل ہے جو اس کی عام عادت کے گو خلاف ہو مگر عادتِ خاصہ کے خلاف نہیں ہوتا۔ کیونکہ خاص اوقات میں مخصوص مصالح کی بنا پر عام عادت کو چھوڑ کر خوارق و معجزات کو ظاہر کرنا یہ بھی حق تعالیٰ کی خاص عادت ہے۔"

اشیائے مادیہ اور ان کی معروف صفات و خصوصیات کا ملازمہ ان کی عمومی طبیعت

یا قدرت کی عمومی عادت ہے لیکن اس کے علاوہ ان چیزوں کی ایک خصوصی طبیعت. یا قدرت کی خصوصی عادت بھی موجود ہے جس کا انکار کٹ حجتی اور بے جا ڈھٹائی کے سوا اور کچھ نہیں. ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ وہ طبیعت یا عادتِ عامہ کی طرح کسی بھی ایسے ضابطے یا قانون کا پابند ہرگز نہیں جس کو انسان کی فلسفیانہ ترکتازیوں نے کسی حقیقت کے کئی جزئیات کا ناتمام مطالعہ کر کے کلیئے کے صورت میں اخذ اور مستنبط کیا ہو۔

یہاں تک تو اعیانِ موجودات اور ان کے اندر نافذ نوامیسِ طبعیہ ـــــ عادیات ـــــ اور فلتاتِ طبعیہ ـــــ خوارق ـــــ کا بیان تھا۔ قریب قریب اسی ـــــ مگر اپنے حدود اور دائرہ اثر کے اعتبار سے وسیع تر ـــــ رنگ ڈھنگ پر اعراض و معانی کا ایک اور نظام بھی موجود ہے اور اس میں بھی قدرت کی عادت عام و خاص کے دو خانوں میں بٹی ہوئی ہے. انسانی اقوال و اعمال کا تعلق اسی عالم سے ہے۔ چنانچہ اسی عالم (عالم اعیان) کے نہج پر ان کے آثار و خواص کے ظہور میں بھی ترتیب و باقاعدگی اور بے ترتیبی و بے قاعدگی دونوں کا موجود ہونا ثابت اور معلوم ہے ۔ یہاں بھی اقوال و اعمال کی بابت قدرت کی عادت عامہ یہی ہے کہ خود انسان اور ساری کائنات پر حسب المراتب ان کے اچھے بُرے اثرات پڑتے رہتے ہیں۔ لیکن قدرت کی عادتِ خاصہ کے سوا اس پہلو سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ بارہا ان اقدار پر ان کے موافق کوئی ـــــ دنیوی یا اخروی یا دینوی و اُخروی ـــــ نتیجہ مرتب نہیں ہونے دیا جاتا ـــــ!!

اگرچہ امکان کے درجے میں ہر قسم کے اقدار کو بے اثر بنایا جا سکتا ہے لیکن فعلی طور پر طاعات کے سلسلے میں إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ○ اور ان جیسے دوسرے نصوص میں بڑے شد و مد کے ساتھ اس کی نفی منقول ہے کہ طاعات پر جزاء کا ترتب قدرت کا ایک وعدہ ہے جس کی ادنیٰ درجہ خلاف ورزی بھی محال و ممتنع لغیرہ کے قبیل سے ہے۔ ہاں معاصی کے سلسلے میں یہ طریقۂ کار امکان سے گذر کر اکثر و بیشتر واقع ہوتا رہتا ہے ۔

قرآنی ارشاد

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ ۔ (سورۂ فاطر آیت ۴۵)	اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے اعمال کے سبب فوراً داروگیر فرماتے تو روئے زمین پر ایک متنفس کو نہ چھوڑتا۔

ہیں ان دو باتوں پر کس خوبی سے آگاہ کیا گیا ہے کہ انسان کی ہر عملی کیفیت اس کی اپنی ذات کی طرح دوسری کائنات کو بھی متاثر کرتی ہے اور یہ کہ بارہا قدرت انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کی نسبت اپنی عادتِ عامہ کو چھوڑ کر عادتِ خاصہ کو بروئے کار لاتی ہے یعنی یہ کہ انسانی کیفیات کی اثر اندازی اور کائنات کی اثر پذیری کو معطل کر دیتی ہے۔ قرآن حکیم کی کئی دوسری آیات اس حقیقت کے اظہار و اثبات میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح ہیں۔ مثلاً

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ	اور تم کو (اے گنہ گارو!) جو کچھ مصیبت
فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ	حقیقتاً پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی
وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝	ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے اور
(سورۃ شوریٰ آیت ۲۰)	بہت سے گناہوں سے درگزر ہی کر دیتا ہے

(باقی آئندہ)

عَنْ عُثْمَانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ

حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے بہترین وہ ہے جو (خود) قرآن سیکھے اور (دوسروں) کو سکھائے

محاضراتِ قرآنی

منعقدہ ۲۸ اکتوبر تا یکم نومبر
اجمالی رپورٹ

مرتبہ: حافظ محمد رفیق

یہ محض اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم اور توفیقِ خاص کا نتیجہ ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اپنی تاسیس (۱۹۷۲ء) سے لے کر اب تک "دعوت رجوع الی القرآن" جیسے بنیادی اہم اور مقدس فرضِ منصبی کی انجام دہی کے لئے قدم بقدم آگے بڑھ رہی ہے۔ دیگر خدمات کے علاوہ (مثلاً ملک کے طول وعرض وبیرونِ وطن دروسِ قرآنی وخطاباتِ عام کا انعقاد، نشر القرآن کیسٹ سیریز کا اجراء اور دعوتی کتب کی اشاعت وغیرہ) باقاعدگی کے ساتھ انجمن پچھلے دس برسوں سے اندرونِ ملک ہر سال مختلف مقامات پر اولاً قرآن کانفرنسوں اور ثانیاً محاضراتِ قرآنی کے نام سے بھرپور اجتماعات ومجالس کا اہتمام کرتی چلی آرہی ہے جن میں بلاتفریق ولحاظِ مسالک، اہلِ علم ودانش خصوصاً ایسے حضرات کو مدعو کیا جاتا ہے، جو قرآن اور اس کی دعوت سے کسی درجے میں قلبی وذہنی مناسبت رکھتے ہیں۔

مزید برآں انجمن کے پلیٹ فارم سے مذہبی فرقہ واریت، تعصب اور گروہ بندی کے بجائے رجوع الی القرآن پر زور دیا جاتا ہے تاکہ اللہ کی اس کتابِ عزیز کے اعتصام کی بدولت گروہ بندی کے بجائے امتِ مسلمہ میں حقیقی ومثبت اتحاد واتفاق پیدا ہو اور تجدید دین اور احیاء اسلام کی راہ ہموار اور منزل قریب آسکے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان تمام مساعی کے نتیجے میں درد مند مخلص اور اہلِ فکر ونظر حضرات کے علاوہ سعید وصالح نوجوانوں کی طرف سے زیادہ عملی تعاون ملا ہے۔ علاوہ ازیں ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ علماء کرام اور جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کے مابین حائل شدہ بُعد اور فاصلے کم ہونے اور باہم ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سننے اور سنانے، سمجھنے اور سمجھانے میں کافی مدد ملی ہے، ہماری دلی دعا ہے کہ جدید وقدیم کے امتزاج (Combination) سے ایک ایسی علمی ودینی قیادت آگے بڑھے جو تشریعی معاملات میں تو تعلق وتمسک مع السلف میں عافیت سمجھے مگر

عصری مسائل و تقاضوں کے حل کے لئے اجتہاد و اکتشاف کی معتدلانہ روش اپنائے۔ (آمین)

محاضراتِ قرآنی کا انعقاد عموماً سال بعد تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر ہوتا ہے، جس میں عام شرکاء و حاضرین کے علاوہ تنظیمی رفقاء کی شرکت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ۸۳ء میں معمول کے مطابق محاضرات اپریل میں منعقد ہوئے تھے لیکن اکتوبر ۸۳ء میں محاضرات کا ایک خصوصی پروگرام تشکیل دیا گیا۔ گویا ۸۳ء کے دوران محاضرات دو بار منعقد ہوئے۔ ہوا یوں کہ جناب قاضی عبدالقادر صاحب مرکزی انجمن خدام القرآن کی نظامت اعلیٰ پر فائز ہونے کے دوران اگست/ستمبر ۸۳ء میں بھارت اپنے اعزہ و اقارب سے ملنے تشریف لے گئے تو اس موقع پر ہندوستانی علماء کرام سے گفت و شنید کے بعد واپسی پر یہ پروگرام تشکیل دیا گیا جس میں مقامی شرکاء کے علاوہ ہندوستان سے آٹھ علماء و دانشوروں کی تشریف آوری متوقع تھی۔ خاص طور پر مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدظلہٗ ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی دیوبند (بھارت) اور مدیر ماہنامہ برہان دہلی نے اکتوبر ۸۳ء میں تشریف لاکر محاضراتِ قرآنی میں "دعوتِ قرآن" کے موضوع پر چار مقالے پیش فرمانے کی منظوری عطا فرمادی تھی۔

لیکن ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ پچھلی دفعہ صرف جناب ڈاکٹر قاری محمد رضوان اللہ صاحب (علی گڑھ) نے شرفِ میزبانی بخشا اور مولانا وحید الدین خانصاحب باوجود پوری خواہش اور بھرپور کوشش کے محض ویزا نہ ملنے کے باعث شریک نہ ہوسکے، اس دفعہ مولانا عبدالکریم صاحب (پاریکھ (ناگپور) اور مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب مہتمم جامعہ رحیمیہ درگاہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، دہلی (بھارت) ہی تشریف لاسکے جبکہ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ویزا کی فراہمی اور دلی آمادگی و خواہش کے باوجود تشریف نہ لاسکے۔ اس کی وجہ انہوں نے اپنے مراسلہ میں یہ بتائی کہ انہوں نے ایک دوسرے صاحب کو ریلوے ٹکٹ کی ریزرویشن کی ذمہ داری سونپی تھی جو خود بھی محاضرات میں مدعو تھے مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ ان صاحب نے تو کسی مجبوری کے باعث عین وقت پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کا ریلوے ٹکٹ بھی نہیں خرید سکے اور بکنگ کا کوئی انتظام بھی نہیں کرا سکے۔ جس کے باعث مولانا موصوف کی لاہور تشریف آوری نہ ہوسکی۔

بہرکیف! مولانا موصوف نے اس کی تلافی کا وعدہ ازراہِ شفقت و عنایت یوں فرمایا ہے کہ اب آئندہ کسی بھی موقع پر از خود جب وہ پاکستان (لاہور) تشریف لائیں گے تو مجوزہ

چار خطبات "دعوتِ قرآن" کے موضوع پر ارشاد فرمائیں گے۔

اس تمہید کے بعد اب مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے تیسرے محاضراتِ قرآنی منعقدہ ۲۸ راکتوبر تا یکم نومبر ۱۹۸۳ء بمقام جناح ہال (ٹاؤن ہال) کی اجمالی رپورٹ پیش خدمت ہے۔

پہلا باقاعدہ اجلاس محاضراتِ قرآنی کا پہلا باقاعدہ وافتتاحی اجلاس مورخہ ۲۸ راکتوبر بروز جمعۃ المبارک بعد نماز مغرب زیر صدارت مولانا محمد حنیف صاحب ندوی منعقد ہوا، ہمارے کوئٹہ کے جواں سال رفیق محترم قاری شاہد اسلام بٹ صاحب نے اپنی خوش الحان تلاوتِ کلام اللہ کے ذریعے اجلاس کا آغاز کیا اس کے بعد افتتاحی خطاب ومقالہ کے لئے مولانا عبدالکریم صاحب پاریکھ (ناگپور - انڈیا) کو دعوت دی گئی۔ ان کا موضوع تھا "قرآن مجید، قرآن مجید کی روشنی میں" جس میں انہوں نے تنزیلِ قرآنی اور بعثتِ نبوی کے بنیادی مقاصد کو بڑے سادہ اور عام فہم انداز میں پیش کیا اور تذکیر بالقرآن کا نہایت مؤثر اور دلنشیں انداز میں حق ادا کیا۔ سامعین اشکبار آنکھوں اور مضطرب قلب کے ساتھ ہمہ تن متوجہ ہو کر ان کے خطاب میں ڈوبے رہے۔

یہ عجیب وغریب مماثلت ہے کہ "دعوت رجوع الی القرآن" کے ضمن میں جو اہمیت ومقام پاکستان میں امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو حاصل ہے وہی مقام "تذکیر بالقرآن" کے حوالے سے ہندوستان میں مولانا پاریکھ مدظلہٗ العالی کا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ استحضارِ قرآن اور تذکیر بالقرآن کی حد تک مولانا پاریکھ صاحب کو امتیاز حاصل ہے۔ مولانا پاریکھ صاحب نے بتایا کہ اس وقت ہندوستان میں ان کے زیرِ انتظام دو ہزار ایسے مراکز ہیں جہاں درسِ قرآن اور قرآنی مذاکروں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ....

گویا اشاعت وتوسیع دعوتِ قرآنی کے جس مشن کے لئے پاکستان میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سرگرم عمل ہیں کم وبیش وہی کام .... یعنی دعوت وتبلیغ، انذار وتبشیر، وعظ ونصیحت اور تذکیر وعبرت پذیری کی خدمت مولانا پاریکھ صاحب عمومی سطح پر بھارت میں انجام دے رہے ہیں۔

اس کے بعد مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب (کراچی) خلیفہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے "قرآنی نگاہ میں تاریخ کا مقام" کے عنوان سے اپنا علمی مقالہ پڑھ کر سنایا کہ اگر امم سابقہ کے تفصیلی حالات وواقعات نہ بھی ملتے تو بھی قرآن مجید میں "سورۃ العصر" کی موجودگی

اس کے لئے کافی تھی، مزید یہ کہ قرآن مجید میں جن دس بیس مشہور قوموں کا ذکر آیا ہے، ان کے بھی تفصیلی حالات سے اجتناب کیا بلکہ اختصار کے ساتھ ان کے تاریخی واقعات محض اس لئے بیان کئے تاکہ

اوّلاً، مجرّد تاریخیت کے بجائے ان واقعات سے ہدایت اخذ کرنے کا کام لیا جائے

ثانیاً، ان تاریخی واقعات کو تذکیر و عبرت کے پہلو سے دیکھا جائے نہ کہ انہیں جزوِ ایمان سمجھ لیا جائے۔

ثالثاً، یہ کہ قرآن اپنے حاملین کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتے، جسے خود اپنی قلب ماہیت کا خیال نہ رہا ہو۔

آخر میں زور دے کر معزز مقالہ نگار نے یہ بات واضح کی کہ تاریخ کو کسی بھی دور میں قطعیت حاصل رہی ہے اور نہ رہے گی، بلکہ تاریخ دانی کا ماحصل محض عبرت آموزی اور تذکیر پذیری ہے، مقالہ نگار نے تاریخ کی بے اعتباری کو قرآن سے ثابت کیا اور مزید استشہاد کے لئے انہوں نے تاریخ ابن خلدون کے متعدد ابواب کا حوالہ دیا۔

تیسرے مقالہ نگار پروفیسر حافظ احمد یار صاحب تھے، جنہوں نے "کتابت مصاحف میں علاماتِ ضبط کی تاریخ اور ان کا تنوع" کے عنوان سے نہایت دقیق و وقیع اور تحقیقی و علمی مقالہ پڑھا۔ انہوں نے اپنے مقالہ میں "اعراب و اعجام" کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ جہاں تک اعراب اور رموزِ اوقاف کا تعلق ہے تو ابتداءً تو نقاط تک کا وجود بھی نہ تھا اور حروف ہجاء بھی اصلاً تعداد میں صرف چودہ ہی تھے، بنی امیہ کے دورِ خلافت میں نقاط کی ایجاد کے ساتھ حروف کی تعداد بھی بجائے چودہ کے اٹھائیس کر دی گئی، چونکہ ب ت ث اور ج ح خ وغیرہ جیسے دیگر ہم شکل و صورت حروف ابتداءً ایک (مفرد) شمار ہوتے تھے البتہ بول چال اور لکھائی و پڑھائی میں قدیم عرب اس کی تمیز بخوبی کر سکتے تھے مگر اموی دور میں اعراب کے ساتھ یہ مشکل بھی عجمیوں کے لئے آسان تر بنا دی گئی۔

"مسلمانوں کی دینی ذمہ داریاں، قرآن حکیم کی روشنی میں" کے عنوان سے چوتھا مقالہ امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے پڑھ کر سنایا اور بعض مقامات پر اختصار کے ساتھ وضاحتی اشارات پیش کئے۔ مگر اصلاً اسی موضوع کو دوسری نشست کے علاوہ، تیسری، چوتھی اور پانچویں نشستوں میں مقالہ پڑھنے کے بجائے تقریر کے ذریعے مزید کھول کر بیان فرمایا۔ اس امید کے ساتھ کہ

جہاں تک عوام کا تعلق ہے وہ اپنے دینی فرائض و ذمہ داریوں کا احساس کریں اور عملاً اس کی طرف پیش قدمی کریں اور محاضرات میں موجود علماء کرام سے خصوصاً اور دیگر حضرات علماء کرام سے جو موجود نہیں تھے عموماً یہ استدعا کی گئی کہ فرائض دینی کا جو تصور انہوں نے پیش کیا ہے اگر وہ صحیح ہے تو توثیقی کلمات سے نوازیں بصورت دیگر اصلاح فرمائیں دونوں صورتوں میں شکریے کے مستحق ہوں گے۔

آخر میں صاحب صدر، مولانا محمد حنیف ندوی صاحب نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ انہوں نے قرآنی اسلوب کے ضمن میں ترکیب نحوی، قرآنی فصاحت و بلاغت اور اس کے ملکوتی غناء پر روشنی ڈالی۔

مزید برآں فاضل صدرِ مجلس نے واضح کیا کہ اثبات باری تعالیٰ کے لئے قرآن مجید نے کسی ایسی منطقی دلیل کو بنیاد نہیں بنایا جسے منطق ہی کے ذریعے کاٹنا ممکن ہو بلکہ قرآن کے نہایت سادہ انداز میں عقل و فطرت کو براہ راست اپیل کرنے کا انداز اختیار کیا ہے اور بار بار اس بات کی دعوت دی ہے کہ تم لوگ کائنات اور مظاہر فطرت میں غور کرو تمہیں ان مظاہر کے پردے میں اللہ واحد کی جھلک نظر آئے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی طرح قرآنی مضامین کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ وہ بجائے جزوی ہونے کے معاشرتی و انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی و محیط ہیں۔

اسی طرح انہوں نے فرمایا کہ تاریخ پر نہ تو کلی اعتماد کرتے ہوئے اسے صحیح سمجھ لیا جائے اور نہ ہی غلط قرار دے کر اسے بالکلیہ ٹھکرایا جا سکتا ہے بلکہ تاریخ کا اصل مقام یہ ہے کہ تاریخ عبرت پذیری کا ایک نادر نمونہ ہے جس سے اچھائی کو اپنانے اور برائی کو چھوڑنے میں مدد و رہنمائی لی جا سکتی ہے۔

دوسرا اجلاس محاضراتِ قرآنی کا دوسرا باقاعدہ اجلاس مورخہ ۲۹ اکتوبر بعد نماز مغرب زیر صدارت مولانا محمد متین ہاشمی منعقد ہوا۔

اس اجلاس کے پہلے مقرر حسب اعلان مولانا عبدالکریم صاحب پاریکھ (ناگپور انڈیا) تھے۔ یہ اعلان پہلے اجلاس کے افتتاحی خطاب کے بعد حاضرین کی خواہش و دلچسپی کے پیش نظر کیا گیا تھا چونکہ ان کے پہلے خطاب سے شرکاء انتہائی متاثر تھے۔ مولانا نے اس زحمت کو خندہ پیشانی سے قبول فرمالیا۔

ان کے آج کے خطاب کا خلاصہ یہ ہے کہ جنت سے زمین کی طرف نسلِ آدم کا ہبوط و انتقال کسی گناہ کی سزا کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ اصل مقصود ابتلاء و امتحان تھا کہ اس وقفۂ امتحانی میں کھرے و کھوٹے اور صحیح و غلط کی تمیز ہو جائے۔ مزید یہ فرمایا کہ پوری ذی روح مخلوق میں صرف قلب انسانی ہی نزول وحیٔ قرآن کا پلیٹ فارم بنایا گیا ہے۔ جبکہ باقی مخلوق نے اس سے عجز و معذوری ظاہر کی۔ پھر یہ کہ انبیاء و رسل کا وجود اس کائنات میں بمنزلہ نور و روشنی تھا کہ جن کی بعثت کا مقصد قطع عذر اور اتمامِ حجت تھا۔ اور پیغمبر کی حیثیت رات کے وقت اللہ کے سامنے انسانیت کے نمائندے اور دن کے وقت لوگوں کے مابین اللہ کے نمائندے و پیغام رساں کی تھی، یہی سنتِ رسول، ہر داعی اسلام سے مطلوب ہے کہ وہ رات اور دن کی ان دونوں ذمہ داریوں کو کمال توازن سے نبھائے کہ دن کے اوقات اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے تبلیغ کتاب کرے اور نظام عدل و قسط (میزان) کے قیام کے لئے ہر ممکن جد و جہد کرے جبکہ راتیں اس کی اللہ کے حضور انسانیت کی صلاح و فلاح اور رشد و ھدایت کے لئے دعاؤں میں گزریں۔

اس کے بعد مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی (مہتمم جامعہ رحیمیہ درگاہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، دہلی۔ انڈیا) نے اپنا مقالہ بعنوان "قرآن کریم اور نہی عن المنکر" پیش فرمایا جو ان شاء اللہ جلد ہی "حکمتِ قرآن" میں شائع ہوگا۔

آج کے چوتھے مقرر مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب تھے، جنہوں نے "قرآن اور تصوف" کے موضوع پر مختصر خطاب فرمایا اور اس ضمن میں قرآن کی متعدد آیات سے استشہاد کیا۔ فاضل مقرر نے وضاحت کی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی کہ تصوف کے ساتھ جو رائج الوقت رنگینیاں منسوب کی جاتی ہیں یہ خود ساختہ رسوم و رواج ہمارے لئے موجب عار و ننگ ہیں ان کا اسلامی اور قرآنی تصوف سے کوئی واسطہ و تعلق نہیں ہے۔ اور دراصل اسلامی تصوف 'احسان' ہی کی ایک شکل ہے۔ البتہ اگر احسان ہی کی اصطلاح کو عام کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ بڑی مبارک اور احسن کوشش ہوگی۔

انہوں نے تصوف یعنی احسان کو "قالب اور روح" سے تعبیر کیا کہ اسلامی عبادات و اعمال کی ظاہری شکلیں محض قالب ہی بن کر نہ رہ جائیں بلکہ ان میں "روح" کا ہونا از حد ضروری ہے۔ انہوں نے نماز کی ظاہری حرکات و سکنات کو "قالب نماز" اور اس کے

لئے مطلوبہ خشوع وخضوع جیسی باطنی کیفیات کو "روحِ نماز" سے تعبیر فرمایا۔ مزید براں انہوں نے تصوّف کے حوالے سے رہبانیت کی نفی کی اور فرمایا کہ شیخ محی الدین اکبر ابن عربیؒ کو تصوف کے میدان میں رہبانیت کا موجد و بانی کہہ کر نشانہ تنقید بنایا جاتا ہے۔ جبکہ ان کی تعلیم یہ ہے کہ فی الواقع تصوّف قربِ الٰہی اور تلاشِ الٰہی کا دوسرا نام ہے اور اس تلاش کے بعد ہی بندگی کا اصل لطف وحظ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ تبلیغ دین کے لئے مختلف اسالیب سے دعوت دیتے رہے ہیں موصوف نے فرمایا کہ عارف وہ نہیں ہے جو اسباب کو ترک کر دے بلکہ عارف تو وہ ہے جو اسباب اختیار کر کے اسی میں عرفتِ ربانی پائے۔

آخر میں صدر جلسہ نے صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا اور پڑھے گئے مقالوں میں سے خصوصاً مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی کے علمی و تحقیقی مقالہ کی تعریف و توصیف کے بعد بھرپور انداز میں تبصرہ کیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں بجا طور پر مذکورہ حکمت و مصلحت کو ملحوظ رکھا جائے مگر اس دوران سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع میں بیان کردہ "نصائح لقمانیؑ"، جو انہوں نے اپنے بیٹے کو تلقین فرمائی تھیں کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے جن میں مقام عزیمت اور صبر و مصابرت کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے کہ محض مصلحت آمیز تبلیغ اور امر بالمعروف کی نرمی مٹھاس ہی کافی نہیں بلکہ نہی عن المنکر کی راہ، جو مقام عزیمت اور صبر و مصابرت کی متقاضی ہے، اس سے بھی گزرنا لازمی ہے، اس لئے حق پرست داعی اسلام کو اس کٹھن اور مشکل مرحلہ سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیئے۔ صدر جلسہ نے تاریخ اسلامی سے اس کی مثالیں پیش کیں۔

تیسرا باقاعدہ اجلاس

پروگرام کے مطابق محاضراتِ قرآنی کا تیسرا باقاعدہ اجلاس ۳۰ اکتوبر کو بعد نماز مغرب زیر صدارت مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب (ناگپور۔ انڈیا) منعقد ہوا۔

اس میں پہلا مقالہ ڈاکٹر منیر احمد صاحب مغل (لاہور) نے "مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کی تفسیرِ قرآن" کے عنوان سے پڑھ کر سنایا۔ مقالہ خاصہ طویل تھا۔ اور وقت کی کمی کے باعث اسے ادھورا چھوڑنا پڑا۔

مقالہ نگار نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی پیدائش سے ان کے انقلابی فکر تک کے مراحل کے چیدہ چیدہ واقعات کا تفصیلی ذکر کیا کہ وہ کس طرح سکھ مذہب سے اسلام کی طرف راغب ہوئے

اور پھر یہ کہ ان کی فطری ودیعت شدہ ذکاوت و فطانت کے ساتھ قدرتی طور پر انہیں کیسے کیسے عمدہ ماحول اور عظیم رجال کی صحبتیں میسر آتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے دستِ راست انقلابی شاگرد کی حیثیت سے کابل سے روس پہنچے۔

مولانا سندھیؒ کی تفسیرِ قرآن کے متعلق جو کچھ مقالہ نگار نے پڑھ کر سنایا وہ یہ کہ قرآن حکیم بنفسِ نفیس "آلۂ انقلاب" ہے۔ انقلابی زندگی کا منبع و سرچشمہ ہے جو جملہ مراحل اور ضروریات کا کفیل ہے۔ قرآن کی اتباع اقوامِ عالم کی سیادت و قیادت کا پیش خیمہ ہے اور اس سے اعراض در و گردانی ذلت و پستی کا باعث ہے۔ چونکہ قرآن حکیم کے اصول بین الاقوامی ہیں۔ گویا اس پر عمل پیرا ہونے کا منطقی انجام "حکومت و خلافت" کا حصول ہے۔ جو بقول مولانا سندھیؒ کے دنیا میں اللہ کا سب سے بڑا انعام و عطیہ ہے اور اس سے محرومی در حقیقت اللہ کی ناراضگی اور ذلت و رسوائی کا مصداق ہے۔ یوں محسوس ہوا کہ شاید مولانا کی پوری تفسیر حکومتی احوال و اصولوں سے معمور ہے۔ یہاں تک کہ بعض عائلی و خاندانی احکامات پر مبنی آیات سے سیاسی قواعد و قوانین مستنبط کئے گئے ہیں۔ الغرض مقالہ نگار نے مولانا سندھیؒ کی تفسیرِ قرآن سے اقتصادی، سیاسی و معاشرتی مسائل پر انقلابی طرزِ فکر سے روشنی ڈالی جس سے مولانا سندھیؒ کے انقلابی تصور کی شدت کا پتہ چلتا ہے۔

آج کے اجلاس کے دوسرے مقالہ نگار، مولانا الطاف الرحمٰن صاحب بنوی، استاذ قرآنیہ اکیڈمی تھے۔ انہوں نے "اسلام کے جماعتی نظام" پر انتہائی مدلل و محققانہ مقالہ پیش فرمایا اس نہایت دقیق، بلیغ اور جامع مقالے پر منطق و علم کلام کا رنگ غالب تھا۔ مولانا نے فرمایا: کہ مسلمان بننے کے لئے تو بیعت کی ضرورت نہیں ہے مگر اقامتِ دین جیسے اہم فریضے کی ادائیگی کے لئے التزام کے ساتھ بیعت کی ضرورت ہے، جو اقربِ الی السنۃ ہے۔ اس کے ثبوت و جواز کے لئے جہاں انہوں نے عہدِ نبویؐ، خلافتِ راشدہ اور عہدِ قریب تک، امورِ خیر، اعمالِ صالحہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مثالیں دیں، ساتھ ہی عقلی و منطقی جواز فراہم کرنے کے لئے نظامِ کائنات کے تکوینی اور پھر خارجی شواہد پیش کئے۔ خصوصاً یہ کہ تکوینی اجتماع کے بعد خارجی اجتماعیت کی مختلف شکلیں جیسے جیسے عقل و شعور کی بالیدگی اور پختگی کی طرف بڑھتی رہتی ہیں، اسی حساب سے ان میں اجتماعیت مضبوط و پختہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ اقامتِ دین کے لئے التزامِ جماعت ضروری ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ اجتماعیت بیعت کی بنیاد پر ہونی چاہئے۔

اس کے بعد امیرِ محترم نے اپنے پہلے اجلاس میں پڑھے گئے مقالے کی تشریح و تبیین کے

تسلسل کو جاری رکھا اور آخر میں صدرِ جلسہ مولانا عبدالکریم صاحب پاریکھ نے صدارتی کلمات چند لطیفوں کی شکل میں سامعین کے گوش گزار کئے۔ لطیفوں کی نوعیت اور اس پر مستزاد مولانا کا یمنی لب ولہجہ، جس سے سامعین کی اکثریت کافی محظوظ ہوئی۔ البتہ بعض حضرات کے ذوق پر یہ انداز گراں گزرا۔

چوتھا باقاعدہ اجلاس

محاضراتِ قرآنی کا چوتھا باقاعدہ اجلاس ۳۱ اکتوبر کو حسب سابق بعد نمازِ مغرب منعقد ہوا۔ حسب اعلان آج کے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر برہان احمد صاحب فاروقی کو کرنا تھی مگر انتظار کے بعد ان کی عدم موجودگی میں ڈاکٹر سلیم فارانی صاحب کو قائم مقامی سونپی گئی۔ انہوں نے اپنی سابقہ روایت کے مطابق آغاز ہی میں "انسانی تعلیم و تربیت کے قرآنی مقاصد" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا جو بیک وقت مقالہ اور پیشگی خطبۂ صدارت شمار کیا گیا۔ انہوں نے انسانی ہدایت و رہنمائی کے لئے قرآن کو ماخذ قرار دیا اور حقیقی خوشحالی و ترقی کے لئے تعلیم و تربیت کو ناگزیر قرار دیا اور یہ کہ اس تعلیم و تربیت کا مرکز و محور قرآن ہونا چاہیئے اور موجودہ تعلیمی بحران و انحطاط قرآن کی تعلیمات سے اعراض کا نتیجہ ہے۔

آج کے اجلاس کے دوسرے مقرر پروفیسر ساجد علی صاحب (لاہور) تھے، انہوں نے "عالم اسلام کی موجودہ صورتحال" کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے مغربی تہذیب و فلسفہ کے غلبہ و استیلاء کے توڑ کے لئے اہلِ علم اور علماء حضرات کو توجہ دلائی اور پھر انہوں نے موجودہ مسلم معاشرے میں سے تین طبقات کا تذکرہ و تجزیہ پیش کیا کہ

اولاً: **جدید تعلیم یافتہ طبقہ**، جن کے نزدیک نجات کا واحد راستہ مغربی تہذیب سے وابستگی ہے۔

ثانیاً: **مذہبی طبقہ**، جس کی دینی خدمات بجا، مگر وہ وقت کی تبدیلی کا احساس ہی نہیں رکھتا۔

ثالثاً: **احیائی تحریکوں کا طبقہ**، پروفیسر صاحب کے نزدیک یہ طبقہ اگرچہ جدید اصطلاحات میں گفتگو کرتا ہے مگر ان کا علم کلام قدیم اور کردار رجعت پسندانہ ہے۔

آج کی نشست کے تیسرے مقالہ نگار، پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خان صاحب (جامعہ پنجاب) تھے، انہوں نے "عدل معاشی کے قرآنی تصور" پر اپنا مقالہ پڑھا کہ قرآن حکیم معاشی مساوات (Economic equality) کے بجائے معاشی انصاف (Economic Justice)

کا تصور پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد مولانا عبدالکریم صاحب پاریکھ (انڈیا) نے حسبِ پروگرام خطاب فرمایا کہ قرآن کی اصل دعوت کو کھول کھول کر بیان کرنا اور کتمانِ حق سے اجتناب مسلمانوں کا اوّلین فریضہ ہے اور موجودہ معاشی تنگی اور اقوام عالم میں ہماری گراوٹ و پستی قرآن سے اعراض کا نتیجہ ہے۔

آخر میں امیرِ محترم نے "مسلمانوں کی دینی ذمہ داریاں" والے موضوع کے تسلسل کو آگے بڑھایا۔

آخری اجلاس محاضراتِ قرآنی کا آخری اجلاس یکم نومبر بعد نماز مغرب، مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی (انڈیا) کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔

صدرِ جلسہ نے اپنا مکتوبہ مقالہ، بصورت خطاب ابتدا ہی میں سنا دیا جس کا عنوان تھا سورۃ الصف کی مرکزی آیت "هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ" کا مفہوم خاندانِ ولی اللہی کے نقطۂ نظر سے"، جس کا حاصل مولانا نے یہ بیان فرمایا کہ اقامت و غلبۂ دین کی ذمہ داری صرف نبی اکرمؐ کی تھی جو انہوں نے پوری کر دی اب امت کی جو ذمہ داری ہے وہ غلبہ و اقامتِ دین سے زیادہ "ابلاغ دین" کی ہے۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے میدانِ عرفات میں "فلیبلغ الشاھد الغائب" کے الفاظ ارشاد فرمائے۔ انہوں نے فرمایا کہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ علماء کرام نے تبلیغی اور تعلیمی جملہ تقاضے پورے کئے جس کے وہ مکلف بنائے گئے تھے۔ مولانا نے اس آیت کے ضمن میں شاہ عبدالقادرؒ کا نقطۂ نظر یہ سنایا کہ "(۱) اللہ نے اس دین کو ظاہری سطح پر ایک مدت تک غالب کیا (۲) مگر دوسرا غلبہ "دلیل و برہان" کا ہے وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ مولانا نے مسلمان علماء اور سیاسی اقتدار کے حامل حکمرانوں کی ذمہ داریوں کو الگ الگ تقسیم کیا جو ایک دوسرے سے مختلف اور الگ ۔۔۔ بھی ہیں اور باہم ممد و معاون بھی۔

پانچ روزہ محاضراتِ قرآنی کے اختتام پر مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی اپنے اعزہ و اقارب سے ملنے کراچی تشریف لے گئے اور امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خواہش پر مولانا موصوف کراچی سے واپسی پر دوبارہ لاہور تشریف لائے تو مزید دو پروگرام ترتیب دیئے گئے۔ ایک جامع القرآن میں ۔۔۔ ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء بعد نماز مغرب امیرِ محترم کے ہفتہ وار درسِ قرآن کے بعد مولانا قاسمی صاحب نے "بھارت میں اسلام کا مستقبل" کے عنوان سے خطاب فرمایا کہ ہندوستان میں سیکولرازم کے باعث جملہ مذاہب آزاد ہیں اور وہاں مسلمان بھی ڈٹ کر توحید بیان کرتے ہیں۔ اور شرک و مروجہ

اوہام پرستی کی تکذیب کرتے ہیں۔ مگر جونہی مولوی صاحب توحید کے بیان کے بعد واپس آتے ہیں تو ہندو لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ توحید خالص خود مسلمانوں کے اندر کیوں موجود نہیں ہے بلکہ ہندو ہمیں طعنہ دیتے ہیں کہ چلو ہمارے اندر اگر جملہ توہم پرستی و شرک موجود ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا مذہب کئی ہزار سال پرانا ہے جبکہ تمہارا اسلام تو ایک ہزار سال کے اندر ان خرابیوں کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ بات مسلمانوں اور خصوصاً علماء حضرات کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اسلام کا مستقبل ہماری انفرادی زندگی پر منحصر ہے کہ ہم ایمان کے تقاضوں کو سمجھیں اور ان پر خلوصِ دل سے عمل پیرا ہوں۔

دوسرا پروگرام شہر کے وسط میں مسجد شہداء میں مورخہ ۱۲ نومبر بعد نماز عصر منعقد ہوا۔ یہاں امیر محترم کے ہفتہ وار درس قرآن کے بجائے مولانا نے سورۂ یوسف آیت ۔۔۔ کے حوالے سے درس قرآن دیا اور فرمایا کہ اولاد اسرائیل کے غلبے کی پہلی بنیاد جدوجہد پر نہیں اسی لئے یوسف علیہ السلام کو جو اقتدار ملا وہ جدوجہد کا نتیجہ نہیں بلکہ اخلاقی طور پر تفویض ہوا جبکہ نبی اکرمؐ کی پوری زندگی مسلسل جدوجہد پر مبنی ہے اور اسلامی اقتدار اس وقت غالب ہوا جب جدوجہد کے بعد معاشرہ تیار ہو گیا تھا۔ یہ تذکرہ تو بطور جملہ معترضہ آ گیا۔ اب محاضرات کی مزید روداد پیش ہے۔

دوسرے مقالہ نگار مولانا سعید الرحمٰن صاحب علوی، ایڈیٹر خدام الدین نے حفاظتِ قرآن مجید کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔

حفاظتِ قرآن کے لئے احادیث و قرآن سے دلائل دیئے اور کتابتِ وحی اور تدوینِ قرآن کے مراحل تفصیلاً بیان کئے اور کہا چونکہ قرآن تنزیل کے اعتبار سے آخری آسمانی کتاب ہے یا بالفاظ دیگر وحی آسمانی کا Final Edition ہے۔ اس لئے سابقہ کتبِ سماویہ کے برعکس اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود اٹھایا۔

اس کے بعد امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دینی فرائض کے ضمن میں التزامِ جماعت اور نظامِ بیعت پر مفصل خطاب فرمایا ۔۔۔ اور آخر میں مولانا عبدالکریم صاحب پاریکھ (انڈیا) نے سورۃ الاحزاب و دیگر مقامات قرآنی کی روشنی میں عورتوں کے حقوق و فرائض پر خطاب فرمایا۔ اور اس طرح پانچ روزہ محاضراتِ قرآنی کا آخری اجلاس تکمیل کو پہنچا۔

فہم قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعے کے ضمن میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الکہف

ضرور مطالعہ کیجئے

(کتاب کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں چھپ کر آیا ہے)

اعلیٰ سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب طباعت

ھدیہ: ۱۰ روپے

سیرتِ نبویؐ کے ضمن میں ۲ دو عظیم تحفے

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیمِ اسلامی
کے دروس و تقاریر کے دو مجموعے اعلیٰ دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ!

★ رسولِ کاملؐ ★

یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ، اور

فرائضِ دینی اور اُسوۂ رسولؐ

سورۂ احزاب رکوع ۲، ۳ کی روشنی میں

تبلیغی مقاصد کے پیش نظر ۞ ہدیہ صرف چھ روپے فی کتاب ۞ محصول ڈاک علاوہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون — ۸۵۲۶۱۱

ذیلی دفتر: ۱۱ داؤد منزل - نزد آرام باغ، کراچی ۱ ۔ فون برائے رابطہ ۲۱۴۷۰۹

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. 2 | January 1984 | No. 11

امام حمید الدین فراہیؒ

کے تفکر و تدبر قرآن کا مرقع

مجموعہ تفاسیر فراہیؒ

اعلیٰ دبیز کاغذ پر بڑے سائز (۲۲×۲۹/۸) کے ۵۳۶ صفحات
عمدہ آفسٹ کی طباعت اور سنہری ڈائی والی مضبوط اور دیدہ زیب جلد کے ساتھ

ہدیہ صرف -/۶۰ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

اب جمادی الثانی تک طلب فرمانے والے حضرات کو مولانا فراہیؒ کی دو مزید تصانیف: 'اقسام القرآن' اور 'ذبیح کون ہے؟' مفت ارسال کی جائیں گی۔

نوٹ: وی پی ارسال نہیں کیا جائے گا۔ خواہشمند حضرات -/۷۰ روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ کتاب بذریعہ رجسٹرڈ بک پوسٹ ارسال کردی جائیگی

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن، لاہور